سکنڈری اسکول سرٹیفکٹ ایگزامینیشن بورڈ

(بمبئی اسٹیٹ)

انتخاب اردو

ایس - ایس - سی امتحان

۱۹۵۵ - ۵۷ ع

کے لئے

٢٠٥

ثانوی مدرسے کی گیارھویں جماعت کے علاوہ
اور کسی مین استعمال کے لئے نہیں -

انتخاب اردو

برائے ایس - ایس - سی امتحان ۱۹۵۵-۵۷ع

شائع کردہ

بمبئی بک ہاوس

محمد علی روڈ

بمبئی ۳

برائے

ایس - ایس - سی امتحان بورڈ، بمبئی اسٹیٹ، پونہ

ایک روپیہ بارہ آ ـ

نوٹ

(۱) مختلف مضامین جو کہ ان انتخابات میں شامل ہیں۔ ان کو نئی طرز میں ڈھال کر دوبارہ چھاپنے کی اجازت بلا شرکت غیرے ایس۔ایس۔سی امتحان کے بورڈ بمبئی اسٹیٹ، پونہ نے حاصل کرلی ہے۔ اور اپنے لئے مخصوص بھی کرا لیا ہے۔ اسکی میعاد ۳۱ دسمبر ۱۹۵۷ع تک ہوگی۔

(۲) مختلف مضامین کے متعلق جو کہ ان انتخابات میں شامل ہیں۔ بورڈ ان لوگوں کی اجازت کا جن کے نام جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ شکریہ کے ساتھ اعتراف کرتا ہے۔

پہلا ایڈیشن

مارچ ۱۹۵۴ع

Published by BOMBAY BOOK HOUSE and printed in their press: BOMBAY PRESS, Mohamedali Road, Bombay 3.

فہرست مضامین

حصہ نثر

حصہ نظم

میر امن

آزاد بخت

کہنے والے نے کہا ہے کہ آگے روم کے ملک میں کوئی شہنشاہ تھا کہ نوشیرواں کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اس کی ذات میں تھی۔ نام اس کا آزاد بخت اور شہر قسطنطنیہ (جس کو استنبول کہتے ہیں) اس کا پائے تخت تھا۔ اس کے وقت میں رعیت آباد، خزانہ معمور، لشکر مرفہ، غریب غربا آسودہ۔ ایسے چین سے گذران کرتے اور خوشی سے رہتے کہ ہر ایک کے گھر میں دن عید اور رات شب برات تھی۔ اور جتنے چور چکار، جیب کترے، صبح خیزے، اٹھائی گیرے، دغاباز تھے، سب کو نیست و نابود کر کر نام و نشان ان کا اپنے ملک بھر میں نہ رکھا تھا۔ ساری رات دروازے گھروں کے بند نہ ہوتے، اور دوکانیں بازار کی کھلی رہتیں۔ راہی مسافر جنگل میدان میں سونا اچھالتے چلے جاتے۔ کوئی نہ پوچھتا کہ تمہارے منہ میں کے دانت ہیں اور کہاں جاتے ہو؟

اس بادشاہ کے عمل میں ہزاروں شہر تھے اور کئی سلطان نعلبندی دیتے۔ ایسی بڑی سلطنت پر ایک ساعت اپنے دل کو خدا کی یاد اور بندگی سے غافل نہ کرتا۔ آرام دنیا کا جو چاہئے سب موجود تھا۔ لیکن فرزند کہ زندگانی کا پھل ہے، اس کی قسمت کے باغ میں نہ تھا۔ اس خاطر اکثر فکرمند

رهتا اور پانچوں وقت کی نماز کے بعد اپنے کریم سے کہتا که اے الله مجھ عاجز کو تونے اپنی عنایت سے سب کچھ دیا، لیکن ایک اس اندھیرے گھر کا دیا نه دیا۔ یہی ارمان جی میں باقی ھے که میرا نام‌لیوا اور پانی دیوا کوئی نہیں اور تیرے خزانۂ غیب میں سب کچھ موجود ھے۔ ایک بیٹا جیتا جاگتا مجھے دے تو میرا نام اور اس سلطنت کا نشان قایم رہے۔

اسی امید میں بادشاہ کی عمر چالیس برس کی ہوگئی۔ ایک دن شیش محل میں نماز ادا کرکے وظیفه پڑھ رہے تھے۔ ایکبارگی آئینے کی طرف خیال جو کرتے ھیں تو ایک سفید بال موچھوں میں نظر آیا که مانند تار مقیش کے چمک رہا ھے۔ بادشاہ دیکھکر آبدیدہ ہوئے اور ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر دل میں اپنے سوچ کیا که افسوس! تونے اتنی عمر ناحق برباد دی اور اس دنیا کی حرص میں ایک عالم کو زیر و زبر کیا۔ اتنا ملک جو لیا اب تیرے کس کام آوے گا؟ آخر یه سارا مال اسباب کوئی دوسرا آڑاوے گا۔ تجھے تو پیغام موت کا آچکا۔ اگر کوئی دن جئے بھی تو بدن کی طاقت کم ہوگی۔ اس سے یه معلوم ہوتا ھے که میری تقدیر میں نہیں لکھا که وارث چھتر اور تخت کا پیدا ہو۔ آخر ایک روز مرنا ھے اور سب کچھ چھوڑنا ھے۔ اس سے یہی بہتر ھے که میں ہی اسے چھوڑوں اور باقی زندگی اپنے خالق کی یاد میں کاٹوں۔

یہ بات اپنے دل میں ٹھہرا کر، پائین باغ میں جا کر سب مجرائیوں کو جواب دے کر فرمایا کہ کوئی آج سے میرے پاس نہ آوے۔ سب دیوان عام میں آجایا کریں اور اپنے کام میں مستعد رہیں۔ یہ کہکر آپ ایک مکان میں جا بیٹھے اور مصلّا بچھا کر عبادت میں مشغول ہوئے۔ سوائے رونے اور آہ بھرنے کے کچھ کام نہ تھا۔ اسی طرح بادشاہ آزاد بخت کو کئی دن گذرے۔ شام کو روزا کھولنے کے وقت ایک چھوہارا کھاتے اور تین گھونٹ پانی پیتے اور تمام دن رات جاے نماز پر پڑے رہتے۔ اس بات کا باھر چرچا پھیلا کہ آزاد بخت نے گوشہ نشینی اختیار کی۔ چاروں طرف غنیموں اور مفسدوں نے سر اٹھایا اور قدم اپنی حد سے بڑھایا۔ جس نے چاھا ملک دبالیا اور سرانجام سرکشی کا کیا۔ جہاں کہیں حاکم تھے ان کے حکم میں خلل عظیم واقع ھوا۔ ہر ایک صوبے سے عرضی بدعملی کی، حضور میں پہنچی۔ درباری امراء جتنے تھے جمع ہوئے اور صلاح مصلحت کرنے لگے۔

آخر یہ تجویز ٹھہری کہ نواب وزیر عاقل اور دانا ھے اور بادشاہ کا مقرب اور معتمد ھے اور درجے میں بھی سب سے بڑا ھے۔ اس کی خدمت میں چلیں۔ دیکھیں وہ کیا مناسب جان کر کہتا ھے۔ سب عمدہ امیر وزیر کے پاس آئے اور کہا «بادشاہ کی یہ صورت اور ملک کی وہ حقیقت۔ اگر چندے اور تغافل ھوا تو اس محنت کا ملک لیا ھوا مفت

میں جاتا رھے گا۔ پھر ھاتھ آنا بہت مشکل ھے۔» وزیر پرانا قدیم، نمک حلال اور عقلمند، نام بھی خردمند، اسم بامسمیٰ تھا۔ بولا «اگرچہ بادشاہ نے حضور میں آنے کو منع کیا ھے لیکن تم چلو میں بھی چلتا ھوں۔ خدا کرے بادشاہ کی مرضی آوے جو روبرو بلاوے۔» یہ کہکر سب کو اپنے ساتھ دیوان عام تلک لایا۔ ان کو وھاں چھوڑکر آپ دیوان خاص میں آیا اور بادشاہ کی خدمت میں محلی کے ھاتھ کہلا بھیجا کہ «یہ پرانا غلام حاضر ھے۔ کئی دنوں سے جمال جہاں آرا نہیں دیکھا۔ امیدوار ھوں کہ ایک نظر دیکھ کر قدم بوسی کروں تو خاطر جمع ھو۔» یہ عرض وزیر کی بادشاہ نے سنی۔ از بس کہ قدامت اور خیرخواھی اور تدبیر اور جاں نثاری اس کی جانتے تھے اور اکثر اس کی بات مانتے تھے، بعد تامل کے فرمایا «خردمند کو بلا لو۔» بارے جب پروانگی ھوئی وزیر حضور میں آیا، آداب بجا لایا اور دست بستہ کھڑا رھا۔ دیکھا تو بادشاہ کی عجب صورت بن رھی ھے کہ زار نزار رونے اور دبلاپے سے آنکھوں میں حلقے پڑگئے ھیں اور چہرہ زرد ھوگیا ھے۔

خردمند کو تاب نہ رھی۔ بے اختیار دوڑ کر قدموں پر جا گرا۔ بادشاہ نے ھاتھ سے سر اس کا آٹھایا اور فرمایا «لو مجھے دیکھا۔ خاطر جمع ھوئی؟ اب جاؤ۔ زیادہ مجھے نہ ستاؤ۔ تم سلطنت کرو۔» خردمند یہ سن کر ڈاڑھ مار کر رویا

اور عرض کی «غلام کو آپ کے تصدق سے همیشه بادشاهت میسر هے، لیکن جهاں پناه کی یك بیك اس طرح کی گوشه‌گیری سے تمام ملك میں تهلکا پڑگیا هے اور انجام اس کا اچها نهیں۔ یه کیا خیال مزاج مبارك میں آیا؟ اگر اس خانه‌زاد موروثی کو بهی محرم اس راز کا کیجئیے تو بهتر هے۔ جو کچه عقل ناقص میں آوے التماس کرے۔ غلاموں کو جو یه سرفرازیاں بخشی هیں اسی دن کے واسطے که بادشاه عیش و آرام کریں اور نمك پرورده تدبیر میں ملك کی رهیں۔ خدانخواسته جب فکر مزاج عالی کے لاحق هوئی تو بنده‌هاے بادشاه کس دن کام آویں گے؟» بادشاه نے کها «سچ کهتا هے، پر جو فکر میرے جی کے اندر هے سو تدبیر سے باهر هے۔

«سن اے خردمند! میری ساری عمر اسی ملك گیری کے درد سر میں کٹی۔ اب یه سن و سال هوا۔ آگے موت باقی هے، سو اس کا بهی پیغام آیا که سیاه بال سفید هو چلے۔ وه مثل هے، ساری رات سوئے اب صبح کو بهی نه جاگیں؟ اب تلك ایك بیٹا پیدا نه هوا جو میری خاطر جمع هوتی۔ اس لئے دل سخت اداس هوا اور میں سب کچه چهوڑ بیٹها۔ جس کا جی چاهے ملك لے یا مال لے۔ مجهے کچه کام نهیں۔ بلکه کوئی دن میں یه ارادا رکهتا هوں که سب کچه چهوڑ چهاڑ کر جنگل اور پهاڑوں میں نکل جاؤں اور منه اپنا کسی کو نه دکهاؤں۔ اس طرح یه چند روز کی زندگی بسر

کروں۔ اگر کوئی مکان خوش آیا تو وہاں بیٹھ کر بندگی اپنے معبود کی بجا لاؤں گا۔ شاید عاقبت بخیر ہو۔ اور دنیا کو تو خوب دیکھا۔ کچھ مزا نہ پایا۔» اتنی بات بول کر اور ایک آہ بھر کر بادشاہ چپ ہوئے۔

خردمند ان کے باپ کا وزیر تھا۔ جب یہ شہزادے تھے تب سے محبت رکھتا تھا۔ علاوہ دانا اور نیک اندیش تھا۔ کہنے لگا «خدا کی جناب سے ناامید ہونا ہرگز مناسب نہیں۔ جس نے ہیژدہ ہزار عالم کو ایک حکم میں پیدا کیا، تمہیں اولاد دینی اس کے نزدیک کیا بڑی بات ہے؟ قبلۂ عالم! اس تصور باطل کو دل سے دور کرو، نہیں تو تمام عالم درہم برہم ہوجائے گا۔ اور یہ سلطنت کس کس محنت اور مشقت سے تمہارے بزرگوں نے اور تم نے پیدا کی ہے! ایک ذرا میں ہاتھ سے نکل جائے گی اور بے خبری سے ملک ویران ہو جائے گا۔ خدانخواستہ بدنامی حاصل ہوگی۔ اس پر بھی بازپرس روز قیامت کے ہوا چاہے کہ تجھے بادشاہ بنا کر اپنے بندوں کو تیرے حوالے کیا تھا۔ تو ہماری رحمت سے مایوس ہوا اور رعیت کو حیران و پریشان کیا۔ اس سوال کا جواب کیا دوگے؟ پس عبادت بھی اس روز کام نہ آوے گی۔ اس واسطے کہ آدمی کا دل خدا کا گھر ہے اور بادشاہ فقط عدل کے واسطے پوچھے جائیں گے۔ غلام کی بے ادبی معاف ہو، گھر سے نکل جانا اور جنگل جنگل پھرنا کام جوگیوں اور

فقیروں کا ہے، نہ کہ بادشاہوں کا۔ تم اپنے جوں کا کام کرو۔ خدا کی یاد اور بندگی جنگل پہاڑ پر موقوف نہیں۔

اگر منصفی فرمائے اور اس فدوی کی عرض قبول کیجئے تو بہتر یوں ہے کہ جہاں پناہ ہر دم اور ہر ساعت دھیان اپنا خدا کی طرف لگا کر دعا مانگا کریں۔ اس کی درگاہ سے کوئی محروم نہیں رہا۔ دن کو بندوبست ملک کا اور انصاف عدالت میں غریب غربا کا فرمائیں تو بندے خدا کے دامن دولت کے سائے میں امن و امان خوش گذران رہیں۔ اور رات کو عبادت کیجئے اور درود پیمبر کی روح پاک کو نیاز کرکر درویش گوشہ نشین، متوکلوں سے مدد لیجئے اور روز راتب یتیم، یسیر عیال داروں محتاجوں اور رانڈ بیواؤں کو کر دیجئے۔ ایسے اچھے کاموں اور نیک نیتوں کی برکت سے خدا چاہے تو امید قوی ہے کہ تمہارے دل کے مقصد اور مطلب سب پورے ہوں اور جس واسطے مزاج عالی مکدر ہو رہا ہے وہ آرزو بر آوے اور خوشی خاطر شریف کو ہو جاوے۔ پروردگار کی عنایت پر نظر رکھئے کہ وہ ایک دم میں جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔» بارے خردمند وزیر کی ایسی ایسی عرض معروض کرنے سے آزاد بخت کے دل کو ڈھارس بندھی۔ فرمایا «اچھا تو جو کہتا ہے بھلا۔ یہ بھی کر دیکھیں۔ آگے جو اللہ کی مرضی ہے سو ہو گا۔»

جب بادشاہ کے دل کو تسلی ہوئی تب وزیر سے

پوچھا کہ «اور سب امیر و دبیر کیا کرتے ہیں اور کس طرح ہیں؟» اس نے عرض کی کہ «سب ارکان دولت قبلۂ عالم کے جان و مال کو دعا کرتے ہیں۔ آپ کی فکر سے سب حیران و پریشان ہو رہے ہیں۔ جمال مبارک اپنا دکھائیے تو سب کی خاطر جمع ہووے۔ چنانچہ اس وقت دیوان عام میں حاضر ہیں۔» یہ سن کر بادشاہ نے حکم کیا «انشاء اللہ تعالیٰ، کل دربار کروں گا۔ سب کو کہہ دو، حاضر رہیں۔» خردمند یہ وعدہ سن کر خوش ہوا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا دی کہ «جب تلک یہ زمین و آسمان برپا ہیں تمہارا تاج و تخت قائم رہے۔» اور حضور سے رخصت ہوکر خوشی خوشی باہر نکلا اور یہ خوشخبری امرا سے کہی۔ سب امیر ہنسی خوشی گھر کو گئے۔ سارے شہر میں آنند ہو گئے۔ رعیت پرجا مگن ہوئے کہ کل بادشاہ دربار عام کرے گا۔ صبح کو سب خانہ زاد اعلا ادنا، اور ارکان دولت چھوٹے بڑے، اپنے اپنے پائے اور مرتبے پر آکر کھڑے ہوئے اور منتظر جلوۂ بادشاہی کے تھے۔

(چہار درویش)

تفتہ کے نام

صاحب کیوں مجھے یاد کیا؟ کیوں خط لکھنے کی تکلیف اٹھائی؟ پھر یہ کہتا ہوں کہ خدا تم کو جیتا رکھے کہ تمہارے خط میں مولوی قمرالدین خاں کا سلام بھی آیا اور بھائی منشی نبی بخش کی خیرو عافیت بھی معلوم ہوئی۔ وہ تو پنشن کی فکر میں تھے۔ ظاہرا یوں مناسب دیکھا ہوگا کہ نوکری کی خواہش کی۔ حق تعالی ان کی جو مراد ہو برلاوے۔ ان کو میرا سلام کہدینا بلکہ یہ رقعہ پڑھوا دینا۔ مولوی قمرالدین خاں کو سلام کہنا۔ تم اپنے کلام کے بھیجنے میں مجھ سے پرسش کیوں کرتے ہو! چار جزو ہیں تو، بیس جزو ہیں تو، بے تکلف بھیجدو۔ میں شاعر سخن‌سنج نہیں رہا۔ صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ وڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا' شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے یہ کیونکر کہا تھا۔ قصہ مختصر وہ اجزا جلد بھیج دو۔

غالب۔ یکشنبہ، ۱۲-اپریل ۱۸۵۸ع

(اردوے معلی)

مجروح کے نام

جان غالب! ابکی ایسا بیمار ہو گیا تھا کہ مجھ کو خود افسوس تھا۔ پانچویں دن غذا کھائی۔ اب اچھا ہوں، تندرست ہوں۔ ذی الحجہ ۱۲۷۶ء تک کچھ کھٹکا نہیں ہے۔ محرم کی پہلی تاریخ سے اللہ مالک ہے۔ میر نصیر الدین آئے کئی بار۔ میں نے ان کو دیکھا نہیں ابکی بار درد میں مجھکو غفلت بہت رہی۔ اکثر احباب کے آنے کی خبر نہیں ہوئی۔ جب سے اچھا ہوا ہوں سید صاحب نہیں آئے۔ تمہاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلی میں ڈھائے گئے اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں جتنی گرد اڑی آسکو آپ نے ازراہ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔ بہر حال اچھے ہو جاؤ اور جلد آؤ۔ مجتہد العصر میر سرفراز حسین کا خط آیا تھا۔ میں نے میرن صاحب کی آزردگی کے خوف سے اسکا جواب نہیں لکھا یہ رقعہ ان دونوں صاحبوں کو پڑھا دینا کہ میر سرفراز حسین صاحب اپنے خط کی رسید سے مطلع ہو جائیں اور میرن صاحب میرے پاس الفت پر اطلاع پائیں۔

(اردوئے معلی)

بنام منشی هیراسنگھ

فرزند سعادتمند منشی هیراسنگھ کے حق میں میری دعائیں قبول هوں اور ان کے جتنے مطالب و مآرب هیں وه عنایت الهی سے پورے هوں۔ بهائی لب‌ساحل کی سند پر یه شعر هے طالب آملی کا:-

مدتی ان گدای خونیں دل
بود تبخالۂ لب ساحل

لب بام، لب فرش، لب گور، لب چاه، لب دریا، لب ساحل، بمعنے کناره کے هے مستعمل اهل ایران۔ لب بام اس مقام کو کهتے هیں که جهاں ایك قدم آگے بڑهائیے تو دهم سے انگنائی میں آئیے۔ پس لب دریا اسے سمجهئے جهاں سے قدم بڑهائیے تو پانی میں جائیے۔ لب ساحل وه هوا جهانسے آگے بڑهے تو دریا میں گرے۔ لب دریا سے پانوں پانی پر رکها جاتا هے، جیسا نهانے کے واسطے۔ اور لب ساحل سے دریا میں کودتے هیں جس طرح سلطان جی کی باؤلی میں لب بام سے تیراك کودتے هیں۔ اسی طرح تیراك جهاں دریا کا پانی نشیب میں هوتا هے وهاں کرارے کے کنارے پر سے کودتے هیں۔ کرارا ساحل اور کرارے کا کناره لب ساحل۔ جو صاحب که لب ساحل کو صحیح نهیں جانتے کیا وه طالب آملی کو بهی نهیں مانیں گے۔ اور اس لفظ پر اعتراض کرنے کا سبب یه هے

که ان بیچاروں نے سوائے گلستان بوستان کے کوئی فارسی کی کتاب نہیں دیکھی- اگر مدت تك قدما کی تصنیفات نظر میں رکھینگے تو یقین ھے کہ دیکھ لینگے-

نجات کا طالب غالب

(ادبی خطوط غالب)

بنام میر مہدی مجروح

آئیے جناب میر مہدی صاحب دھلوی! بہت دنوں میں آئے- کہاں تھے؟ بارے آپ کا مزاج خوش ھے؟ میر سرفراز حسین صاحب اچھی طرح ھیں؟ میرن صاحب خوش ھیں؟

ھستی ھماری اپنی فنا پر دلیل ھے
یانتك مٹے کہ آپ ھم اپنی قسم ھوئے

پہلے یہ سمجھو کہ قسم کیا چیز ھے- قد اس کا کتنا لمبا ھے- ھاتھ پاؤں کیسے ھیں- رنگ کیسا ھے- جب یہ نہ بتا سکوگے تو جانوگے کہ قسم جسم، جسمانیات میں سے نہیں- ایك اعتبار محض ھے- وجود اسکا صرف تعقل میں ھے- سیمرغ کا سا اسکا وجود ھے- یعنی کہنے کو ھو دیکھنے کو نہیں- پس شاعر کہتا ھے کہ جب ھم اپنی قسم ھوگئے تو گویا اس صورت میں ھمارا ھونا نہ ھونیکی دلیل ھے-

تذکیر و تانیث کا کوئی قائدہ منضبط نہیں کہ جسپر حکم کیا جائے- جو جس کے کانوں کو لگے جس کو جس کا

دل قبول کرے اس طرح کہے۔ رتھ میرے نزدیک مذکر ہے، یعنی رتھ آیا۔ لیکن جمع میں کیا کروں گا۔ ناچار مؤنث بولنا پڑے گا، یعنی رتھیں آئیں۔ خبر مؤنث ہے بہ اتفاق۔ مگر «اخبار» اس کو خود سمجھلو کہ تمہارا دل کیا قبول کرتا ہے۔ میں تو مذکر کہونگا یعنی اخبار آیا «پیر» ہوئی یا ہوا۔ یہ منطق عوام کا ہے۔ ہمیں اس سے کچھ کام نہیں۔ ہم کہیں گے دوشنبہ ہوا پیر کا دن ہوا۔ نری پیر ہوئی یا پیر ہوا ہم کیوں بولیں گے۔ بلبل میرے نزدیک مؤنث ہے۔ جمع اس کی بلبلیں۔ طوطی بولتا ہے۔ بلبل بولتی ہے۔ بھائی اس امر میں مفتی و مجتہد بن نہیں سکتا۔ اپنا عندیہ لکھتاہوں۔ جو چاہے مانے جو چاہے نہ مانے۔

سہ شنبہ ۸ دسمبر سنہ ۱۸۶۳ع　　　نجات کا طالب غالب

(ادبی خطوط غالب)

انشا کا انجام

سعادت یار خان رنگین انشا کے بڑے یار تھے اور دستار بدل بھائی تھے۔ چنانچہ سید انشا خود کہتے ہیں:-

عجب رنگینیاں ہوتی ہیں کچھ باتوں میں اے انشا
بہم مل بیٹھتے ہیں جب سعادت یار خاں اور ہم

خاں موصوف کہا کرتے تھے کہ لکھنئو میں سید انشا کے وہ وہ رنگ دیکھے جن کا خیال کر کے دنیا سے جی بیزار ہوتا ہے۔ ایک تو وہ اوج کا زمانہ تھا کہ سعادت علی خاں کی ناک کے بال تھے۔ اپنی کمال لیاقت اور شگفتہ مزاجی کے سبب سے مرجع خلایق تھے۔ دروازے پر گھوڑے، ہاتھی، پالکی نالکی کے ہجوم سے رستہ نہ ملتا تھا۔ دوسری وہ حالت کہ پھر جو میں لکھنو گیا تو دیکھا کہ ظاہر درست تھا مگر درخت اقبال کی جڑ کو دیمک لگ گئی تھی۔ میں ایک شخص کی ملاقات کو گیا۔ وہ اثنائے گفتگو میں دوستانِ دنیا کی ناآشنائی اور بےوفائی کی شکایت کرنے لگے۔ میں نے کہا البتہ ایسا ہے مگر پھر بھی زمانہ خالی نہیں۔ انہوں نے زیادہ مبالغہ کیا۔ میں نے کہا کہ ایک ہمارا دوست انشا ہے کہ دوست کے نام پر جان دینے کو موجود ہے۔ وہ خاموش ہوئے اور کہا کہ اچھا زیادہ نہیں، آج آپ اُن کے پاس جائیے اور

رہئے ہمیں ایک تربوز خود بازار سے لا کر کھلادو۔ موسم کا میوہ ہے۔ کچھ بڑی بات بھی نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ بھلا یہ بھی کچھ فرمایش ہے! وہ بولے کہ بس یہی فرمایش ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ خود لا کر کھلائیں۔ بلکہ ۸ آنے پیسے بھی آپ مجھ سے لے جائیں۔ میں اسی وقت اٹھکر پہنچا۔ انشا عادت قدیم کے بموجب دیکھتے ہی دوڑے صدقے قربان گئے۔ جم جم آئیے۔ نت نت آئیے۔ بلائیں لینے لگے۔ میں نے کہا بہ نازو انداز ذرا طاق میں رکھو۔ پہلے ایک تربوز لا کر کھلاؤ۔ گرمی نے مجھے جلا دیا۔ انہوں نے آدمی کو پکارا۔ میں نے کہا کہ آدمی کی سہی نہیں تم آپ جاؤ۔ اور ایک اچھا سا شہیدی تربوز دیکھ کر لاؤ۔ انہوں نے کہا کہ نہیں آدمی معقول ہے۔ اچھا ہی لائے گا۔ میں نے کہا نہیں، کھاؤں گا تو تمہارا ہی لایا ہوا کھاؤں گا۔ انہوں نے کہا تو دیوانہ ہوا ہے! یہ بات کیا ہے؟ تب میں نے داستان سنائی۔ اس وقت انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا کہ بھائی وہ شخص سچا اور ہم تم دونوں جھوٹے۔ کیا کروں! ظالم کی قید میں ہوں۔ سوا دربار کے گھر سے نکلنے کا حکم نہیں۔ تیسرا رنگ میاں رنگین بیان کرتے ہیں کہ میں سوداگری کے لئے گھوڑے لے کر لکھنئو گیا اور سرا میں آترا۔ شام ہوئی تو معلوم ہوا کہ قریب ہی مشاعرہ ہوتا ہے۔ کھانا کھا کر میں بھی جلسہ میں پہنچا۔ ابھی دو تین سو آدمی آئے تھے۔ لوگ بیٹھے باتیں کرتے تھے۔ حقے پی رہے تھے۔ میں بھی بیٹھا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ ایک شخص میلی کچیلی

روئی دار مرزئی پہنے، سر پر ایک میلا سا پھینٹا، گھٹنا پاؤں میں، گلے میں پیکیوں کا توبڑا ڈالے، ایک ککڑ کا حقہ ہاتھ میں لئے آیا اور سلام علیکم کہہ کر بیٹھ گیا۔ کسی نے اس سے مزاج پرسی بھی کی۔ اس نے اپنے توبڑے میں ہاتھ ڈال کر تمباکو نکالا اور اپنی چلم پر سلفا جما کر کہا کہ بھئی ذرا سی آگ ہو تو اس پر رکھ دینا۔ اسی وقت آوازیں بلند ہوئیں اور گُڑگُڑی سٹک پیچوان سے لوگ تواضع کرنے لگے۔ وہ بیدماغ ہوکر بولا کہ صاحب! ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو نہیں تو ہم جاتے ہیں۔ سب نے اس کی بات کے لئے تسلیم اور تعمیل کی۔ دم بھر کے بعد پھر بولا کہ کیوں صاحب ابھی مشاعرہ شروع نہیں ہوا؟ لوگوں نے کہا جناب لوگ جمع ہوتے جاتے ہیں۔ سب صاحب آجائیں تو شروع ہو۔ وہ بولا کہ صاحب ہم تو اپنی غزل پڑھ دیتے ہیں! یہ کہہ کر توبڑے میں سے ایک کاغذ نکالا اور غزل پڑھنی شروع کردی:-

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصوّر عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

نشانِ نقش پائے رہروان کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار، بیٹھے ہیں

کہاں صبر و تحمل! آہ!! ننگ و نام کیا شے ہے
میاں! رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

وہ تو غزل پڑھ، کاغذ پھینک، سلام علیکم کہہ کر چلے گئے۔ مگر زمین و آسمان میں سناٹا ہوگیا اور دیر تک دلوں پر ایک عالم رہا جس کی کیفیت بیان نہیں ہوسکتی۔ غزل پڑھتے میں میں نے بھی پہچانا۔ حال معلوم کیا تو بہت رنج ہوا اور گھر پر جاکر پھر ملاقات کی۔ چوتھی دفعہ جو لکھنؤ گیا تو پوچھتا ہوا گھر پہنچا۔ افسوس! جس دروازہ پر ہاتھی جھومتے تھے وہاں دیکھا کہ خاک اڑتی ہے اور کتے لوٹتے ہیں۔ ڈیوڑھی پر دستک دی۔ اندر سے کسی بڑھیا نے پوچھا کہ کون ہے بھائی؟ (وہ ان کی بی بی تھیں) میں نے کہا سعادت یارخاں دلی سے آیا ہے۔ چونکہ سید انشا سے انتہائی درجہ کا اتحاد تھا اس عفیفہ نے پہچانا۔ دروازہ پر آکر بہت روئیں اور کہا کہ بھیا ان کی تو عجب حالت ہے۔ اے لو میں ہٹ جاتی ہوں تم اندر آؤ اور دیکھ لو۔ میں اندر گیا۔ دیکھا تو ایک کونے میں بیٹھے ہیں۔ تن برہنہ ہے۔ دونوں زانوؤں پر سر دھرا

ھے۔ آگے راکھ کے ڈھیر ھیں۔ ایک ٹوٹا سا حقہ پاس رکھا ھے۔ یا تو وہ شان و شکوہ کے جمگھٹ دیکھتے تھے، وہ گرمجوشی اور چہلوں کی ملاقاتیں ہوتی تھیں یا یہ حالت دیکھی۔ بے اختیار دل بھر آیا۔ میں وھیں زمین پر بیٹھ گیا اور دیر تک رویا۔ جب جی ہلکا ھوا تو میں نے پکارا کہ سید انشا! سر اُٹھا کر اس نظر حسرت سے دیکھا جو کہتی تھی کہ کیا کروں؟ آنکھ میں آنسو نہیں۔ میں نے کہا کیا حال ھے؟ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا شکر ھے۔ پھر اس طرح سر گھٹنوں پر رکھ لیا کہ نہ اُٹھایا۔

بعض فلاسفۂ یونان کا قول ھے کہ مدت حیات ھر انسان کی سانسوں کے شمار پر ھے۔ میں کہتا ھوں کہ ھر شخص جس قدر سانس یا جتنا رزق اپنا حصہ لایا ھے اسی طرح ھر شے کہ جس میں خوشی کی مقدار اور ھنسی کا اندازا بھی داخل ھے وہ لکھوا کر لایا ھے۔ سید موصوف نے اس ھنسی کی مقدار کو جو عمر بھر کے لئے تھی تھوڑے وقت میں صرف کردیا۔ باقی وقت یا خالی رھا یا غم کا حصہ ھو گیا۔

(آب حیات)

سرسید کی طرز تحریر

عبارت کی سادگی اور بے ساختگی جو سرسید کی تحریر کی عام خاصیت ہے، وہ سنہ ۱۸۷۰ سے پہلے کی تحریروں میں بھی، جبکہ تصنع اور تکلف انشاپردازی کا زیور سمجھا جاتا تھا،" برابر پائی جاتی ہے اور آثارالصنادید کا پہلا اڈیشن جسکی عبارت میں بہت کچھ ساختگی اور تکلف پایا جاتا ہے، وہ جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے تھے مولانا صہبائی کا لکھا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گو اس وقت طبع سلیم کے اقتضا سے خود سرسید کی طرز تحریر سیدھی سادی تھی مگر سوسائٹی کے اثر سے یقینا سادی عبارت لکھنے کو وہ خود حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے جس کی وجہ سے انہوں نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ جن عمارتوں کی تحقیقات نہایت جانکاہ کوشش سے انجام کو پہنچائی ہے اُن کا حال اپنی سیدھی سادی عبارت میں جو اس وقت خود ان کی نظر میں کم وزن معلوم ہوتی تھی۔ تحریر کریں۔ مگر اس اڈیشن کے شائع ہونے کے بعد وہ بہت جلد اس غلطی سے متنبہ ہوئے اور اس کو دوبارہ اپنے سیدھے سادے نیچرل اسٹائل میں لکھکر شائع کیا جس کا فرنچ میں ترجمہ ہوکر فرانس میں چھپا۔

چونکہ سرسید سے قوم کی اصلاح کا عظیم الشان کام ظہور میں آنا تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے اُن کی ذات میں وہ تمام خاصیتیں جمع کردی تھیں جو ایک ریفارمر میں ہونی ضرور ہیں۔ انہیں خاصیتوں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ ابتدا سے تحریر یا تقریر میں تصنع اور الفاظ کی تراش خراش سے نفرت رکھتے تھے اور گریمر کی پابندی سے فطرةً آزاد تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے جو اول اول دلی میں اپنے گرد شعرا کا جمگٹھا دیکھ کر ان کی دیکھادیکھی شعر کہنا شروع کیا تھا، کچھ بہت دن نہ گذرے کہ وہ اُن تکلفات لایعنی سے جو شاعری کے لئے لازم ہیں اور حقائق نگاری میں مخل ہوتے ہیں ہمیشہ کے لئے دست بردار ہوگئے۔ انہوں نے سیرت فریدیہ میں اپنے بچپن کا حال لکھا ہے کہ اُن کے نانا نے جب کہ وہ بوستاں پڑھتے تھے اُن کا سبق سنا۔ سبق میں وہ شعر بھی تھا جس کا پہلا مصرع یہ ہے «طمع را سہ حرف ست ہر سہ تہی» انہوں نے اس کا ترجمہ کیا کہ «طمع کے تین حرف، تینوں خالی» نانا نے تین دفعہ ٹوکا اور بہت خفا ہوئے۔ مگر یہ وہی معنی کہتے گئے۔ چونکہ محاورہ کے موافق ترجمہ یہی فصیح تھا اس لیے گریمر کا مطلق خیال نہ آیا۔ جو حال ان کا اس بچپن کے زمانہ میں تھا وہی اخیر دم تک باقی رہا۔ وہ تحریر یا تقریر کی رو میں گریمر کی کچھ پروا نہ کرتے تھے۔ وہ اُن قیدوں سے جو شاعروں اور منشیوں نے مقرر کی ہیں بالکل آزاد تھے۔ وہ ان غلط لفظوں

کو جو عام فہم اور خاص و عام کی زبان پر جاری ہوں، صحیح الفاظ پر ترجیح دیتے تھے۔ آن کی زبان دلی کی بول چال میں محدود نہ تھی بلکہ جو لفظ یا جو جملہ بے اختیار قلم سے ٹپک گیا وہی آن کی زبان اور وہی بول چال تھی۔ غالباً انہوں نے کسی لفظ کے استعمال کرتے وقت یہ خیال نہ کیا ہوگا کہ یہ لفظ اہل زبان بولتے ہیں یا نہیں؟ اور کسی فقرہ کو لکھ کر پھر نہ دیکھا ہوگا کہ قواعد کی رو سے اس کی ترکیب صحیح ہے یا نہیں؟

یہ خاصیت جس کو ہم نے بیان کیا ایک سچے ریفارمر کے کلام میں ایسی ہی ضروری ہے جیسی سچائی اور راستبازی۔ وہ مثل شاعروں اور انشا پردازوں کے اپنے کلام کی بنیاد الفاظ کی شستگی اور ترکیبوں کی برجستگی پر نہیں رکھتا بلکہ اس بے قرار آدمی کی طرح جو گھر میں آگ لگی ہوئی دیکھ کر ہمسایوں کو بے تابانہ آگ بجھانے کے لئے پکارتا ہے، ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو گھبراہٹ کی حالت میں بے ساختہ انسان کے منہ سے نکل جاتے ہیں۔ وہ واقعات پر تشبیہ واستعارہ کے پردے نہیں ڈالتا بلکہ آن کی ننگی تصویر کھلم کھلا سب پر ظاہر کرتا ہے۔ وہ الفاظ و قواعد کا محکوم نہیں ہوتا بلکہ الفاظ اور قواعد کو اپنے جذبات کا محکوم رکھتا ہے۔

الغرض سرسید نے خیالات کے ظاہر کرنے میں بناوٹ اور تصنع کو کبھی دخل نہیں دیا۔ جس سادگی اور

بے تکلفی کے ساتھ ابتدا میں مطلب نگاری شروع کی تھی غدر کے زمانے تک جو کہ تقریباً بیس برس کا زمانہ ہوتا ہے اپنے اسی سیدھے سادے اور نیچرل اسٹائل میں ہر قسم کی تحریریں، کیا کتابیں کیا مضامین اور کیا مقدمات کے فیصلے اور تجویزیں، برابر لکھتے رہے۔ اس بیس سال کی مشق و مہارت نے جو کہ ایک انداز پر متصل جاری رہی، ضرور ہے کہ ان کے قلم میں ہر مطلب کے ادا کرنے اور ہر پیچیدہ مضمون کے سلجھانے کی ایک غیر معمولی طاقت پیدا کردی ہوگی، کیونکہ نیچرل قوا سے جب آن کے مقتضا کے موافق برابر کام لیا جاتا ہے تو آن سے اکثر فوق العادہ کرشمے ظہور میں آتے ہیں۔ مگر ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا جب کہ اس سیدھی سادی تحریر کے اصلی جوہر کھلنے والے اور اس ٹھنڈی آگ کے شعلے بلند ہونے والے تھے۔

غالباً اس بات پر سب کا اتفاق ہوگا کہ تحریر کا اصل مقصد لوگوں کے دلوں پر اثر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مگر اس امر میں سب کی رائے مختلف معلوم ہوتی ہے کہ اثر کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اسی ایک مقصد کے لئے کوئی الفاظ میں تراش خراش اختیار کرتا ہے اور کوئی سادگی۔ کوئی کلام کی بنیاد متانت اور سنجیدگی پر رکھتا ہے اور کوئی مزاح و ظرافت پر۔ کوئی سوچ سوچ کر علمی اصطلاحیں اور فاضلانہ ترکیبیں استعمال کرتا ہے اور کوئی ڈھونڈھ ڈھونڈھ

کر اهل زبان کے محاورے اور روزمرے بہم پہنچاتا ھے، اسی طرح کوئی کسی ڈھنگ پر چلتا ھے اور کوئی کسی طریقہ پر۔ مگر حق یہ ھے کہ کلام کی تاثیر کو ان باتوں سے کچھ علاقہ نہیں۔

بے شک کلام کے مؤثر ھونے کے لئے اس کا سادہ اور بے تکلف ھونا ضرور ھے، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کلام سادہ اور بے تکلف ھوگا وہ مؤثر بھی ضرور ھوگا۔ کلام کیسا ھی سادہ اور بے تکلف ھو جب تک کہ متکلم کا دل آزادی اور سچائی سے بھرا ھوا نہ ھو، کبھی مؤثر نہیں ھوسکتا۔ جس طرح تلوار کی کاٹ درحقیقت اس کی باڑ میں نہیں بلکہ سپاھی کے کربتی ھاتھ میں ھے اسی طرح کلام کی تاثیر اُس کے الفاظ میں نہیں بلکہ متکلم کی سچائی اور اس کے نڈر دل اور بے لاگ زبان میں ھے۔ وھی الفاظ جو ایک سچے اور دلسوز ناصح کی زبان سے نکل کر لوگوں کے دلوں پر تیر وسناں کا کام کرتے ھیں ممکن نہیں کہ ایک نمائشی واعظ کی زبان پر آن میں کچھ بھی اثر باقی رھے۔ سچے ناصح کے لعن و طعن میں جو اثر ھوتا ھے وہ جھوٹے واعظ کی بشارتوں میں نہیں ھوتا۔ سرسید کے کلام میں جو تاثیر تھی وہ درحقیقت اُن کی سچائی اور حق گوئی کا نتیجہ تھا۔

باوجودیکہ مسلمان صدھا سال سے نہ صرف مذہب میں بلکہ علوم و فنون میں، لٹریچر میں، رسم و رواج میں، اخلاق و عادات میں، طریق معاشرت میں غرضکہ ہر چیز میں اگلوں کی لکیر پر فقیر چلے آتے تھے اور کوئی ایسی بات جس سے کبھی اُن کے کان آشنا نہ ہوئے ہوں ہرگز سننی نہیں چاہتے تھے۔ مگر سچ میں وہ کرشمہ ھے کہ تاریکی میں بھی وہ چمکے بغیر نہیں رہتا۔ جو شخص سب سے پہلے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر اور سوسائٹی کی رکاوٹوں کو برطرف کرکے قوم کی اصلی بھلائی کے خیالات صاف صاف ظاہر کرتا ھے گوکہ وہ قوم کے مذاق اور عادات کے کیسے ھی برخلاف ہوں، اُن میں عجیب قسم کی کشش ہوتی ھے کہ اُن کے سننے کے لیے کیا موافق کیا مخالف سب کے کان کھڑے ہوجاتے ھیں اور دونوں فریق مختلف طور پر اُن سے متاثر ہوتے ھیں۔ پہلا اُن کو حق سمجھ کر بے چون و چرا قبول کرتا ھے اور دوسرا اُن میں مقبولیت کے آثار نمایاں دیکھ کر خائف ہوتا ھے کہ مبادا یہ خیالات تمام قوم میں شائع ہوجائیں۔ سرسید کی تحریر میں یہی چیز تھی جس نے ان سیدھے سادے اور معمولی لفظوں میں جادو کا سا اثر پیدا کردیا تھا اور تمام قوم میں ھل چل ڈالدی تھی۔

مگر اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاھئے کہ سرسید کی تحریر جو بظاھر متعارف لفظی خوبیوں سے خالی معلوم ہوتی تھی درحقیقت اُس میں لفظی خوبیاں نہ تھیں۔ بلکہ اصل بات

یہ ہے کہ جب عمدہ اور پاکیزہ خیالات ایسے صاف اور معنی خیز لفظوں میں بیان کئے جاتے ہیں کہ لفظوں کے ساتھ ہی ساتھ معنی بھی ذہنوں میں اُتر جاتے ہیں تو خیالات کی خوبی ناظرین کو الفاظ کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی، بلکہ محاسن لفظی خیالات کی شکوہ میں دب جاتے ہیں۔ اس کے سوا جب مصنف کی ہمت محض عمدہ خیالات کے پھیلانے پر مقصود ہوتی ہے تو اُس کے بیان میں محاسن لفظی کی اسی قدر گنجائش ہوتی ہے جس قدر کہ ہر مقام کا مقتضا ہوتا ہے اور اس لئے وہ عبارت میں اس قدر گھل مل جاتے ہیں کہ جب تک بہ نظر غور نہ دیکھا جائے عام بیان اُن سے سادہ نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کی تحریر میں لفظی خوبیاں ایسی اجاگر نہیں معلوم ہوتیں جیسی دیگر مصنفوں کے کلام میں معلوم ہوتی ہیں، ورنہ صنائع لفظی کے سوا اس میں تمام محاسن لفظی و معنوی موجود ہیں۔ تشبیہیں بھی ہیں، استعارے بھی ہیں، کنائے بھی ہیں، تمثیلیں برجستہ اور تلمیحیں نہایت لطیف ہیں۔ بذلے اور لطیفے حد سے زیادہ دلکش اور دلفریب ہیں۔ کہاوتیں اور اشعار برمحل جابجا نظر آتے ہیں۔ مگر اس قبیل کی جو چیز ہے اُس میں ایسا بیساختہ پن پایا جاتا ہے کہ گویا بے قصد و بے ارادہ مصنف کے قلم سے ٹپکی ہے۔

مگر جو چیز سرسید اور دیگر مصنفوں اور مضمون نگاروں میں مابہ الامتیاز ہے وہ قدرتِ بیان ہے جس کے

ثبوت کے لئے خود ان کی مختلف تحریروں کا دیکھ لینا کافی ھے۔ مصنف کی قدرتِ بیان کئی شکلوں میں ظاھر ھوتی ھے۔ ایک یہ کہ وہ ھر ایک مضمون کو اسی پیرایہ میں بیان کرسکے جو اُس مضمون کی حالت کے مناسب ھے کیونکہ ھر قسم کے کلام کا پیرایۂ بیان جدا ھوتا ھے۔ جس ڈھنگ پر ناول لکھا جاتا ھے اس ڈھنگ پر تاریخ یا بائیوگرافی نہیں لکھی جاتی۔ جہاں متانت اور سنجیدگی کا موقع ھوتا ھے وھاں ظرافت نازیبا معلوم ھوتی ھے۔ تشبیہ و استعارہ اگرچہ نظم و نثر کا زیور ھے مگر کسی سرشتہ کی سالانہ رپورٹ یا کسی مقدمہ کے فیصلے یا کسی پبلک جلسہ کی روئداد میں اس سے زیادہ کوئی چیز بدنما نہیں ھوتی۔ اسی لئے کہا گیا ھے «ھر سخن وقتی و ھر نکتہ مکانی دارد» مگر جہاں تک دیکھا جاتا ھے ھر مصنف پر اس کی طبیعت کے موافق رفتہ رفتہ کسی خاص پیرایۂ بیان کا رنگ چڑھ جاتا ھے جس کا نتیجہ یہ ھوتا ھے کہ یا تو وہ ایک خاص مضمون کے سوا اور کسی موضوع پر کچھ نہیں لکھ سکتا یا جس موضوع پر قلم اُٹھاتا ھے اس کو اسی خاص رنگ میں رنگنا چاھتا غے۔ مثلاً بعضوں کا قلم حسن و عشق کے میدان میں دوڑتا ھے، پس یا تو وہ ایسے مضمون پر قلم ھی نہیں اُٹھاتے جس میں حسن و عشق کی چاشنی نہ ھو اور یا جو مضمون لکھتے ھیں اُس کو اُسی سانچے میں ڈھالنا چاھتے ھیں۔ اسی طرح بعض کی طبیعت پر استعارہ اس قدر غالب ھوجاتا ھے کہ سیدھے رستے سے بھی چکر کاٹے بغیر

نہیں گذرتے۔ بعضے ہر ایک مضمون میں ظرافت کی چاشنی دینی چاہتے ہیں اگرچہ نفس مضمون اس سے ابا کرتا ہو۔ غرض کہ جس مصنف یا مضمون نگار کو دیکھئے اس پر کوئی نہ کوئی بھوت سوار ہوتا ہے۔

مگر سرسید کی تحریروں کو ہم اس عام قاعدے سے مستثنا پاتے ہیں۔ ان کی ہر قسم کی بیشمار تحریریں کیا تاریخی کیا علمی، کیا مذہبی، کیا اخلاقی، کیا سوشل، کیا پولٹکل، کیا اوفشیل اور کیا لیگل، علیگڈھ گزٹ، تہذیب الاخلاق، تصانیف احمدیہ، سالانہ رپورٹوں، عدالت کے فیصلوں، جلسوں کی روئدادوں اور پرائیوٹ خطوں وغیرہ میں موجود ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک شاخ میں وہی پیرایۂ بیاباں پایا جاتا ہے جو اس کے لئے موزوں اور مناسب ہے حالانکہ مصنف کو خود خبر نہیں کہ کس مضمون کے لیے کونسا پیرایۂ بیان موزوں ہے۔ مگر تحریر کی قدرتی قابلیت بغیر قصد و ارادہ کے قلم کو اسی راہ پر ڈال دیتی ہے جس پر اس کو چلنا چاہئے۔ جس طرح پہاڑ کی رو رستے کے موڑ توڑ اور پیچ وخم کے ساتھ رخ بدلتی چلی جاتی ہے اسی طرح ہر مقام کے مقتضا کے موافق تحریر کا رنگ خودبخود بدل جاتا ہے۔ اگر علمی اور تاریخی مضامین میں دریا کے بہاؤ کی سی روانی ہے تو مذہبی اور پولٹکل تحریروں میں چڑھاؤ کی تیرائی کا سا زور ہے۔ اعتراضات کے جواب میں

متانت اور سنجیدگی ہے تو بے دلیل دعووں کے مقابلہ میں ظرافت و خوش طبعی۔ نصیحتیں نشتر سے زیادہ دلخراش اور مرہم سے زیادہ تسکین بخش ہیں۔ غصہ مہربانی سے زیادہ پرلطف ہے اور نفرین آفرین سے زیادہ خوش آیند۔ وہی ایک قلم ہے جو اخلاق کے بیان میں ایک مورلسٹ کے ہاتھ میں معلوم ہوتی ہے، جو عدالت کے فیصلوں میں ایک کہنہ مشق جج کے ہاتھ میں اور سالانہ رپورٹوں اور جلسوں کی روئدادوں میں ایک تجربہ کار سکریٹری کے ہاتھ میں۔

(حیات جاوید)

سرشار

لکھنؤ

لکھنؤ میں میاں آزاد خانہ برباد اور حضرت خوجی افیونیوں کے مسلم الثبوت استاد نے دو دن پڑاؤ ڈالا اور شہر کے دو مختلف مقاموں پر ایک ایک شب بسیرا لیا۔ پہلی شب آغامیر کی سرا میں بسر کی۔ چوک سیر کو گئے تو دیکھتے کیا ہیں کہ دو رویہ بازار آراستہ، دکانیں قرینے سے سجی سجائی، اشیا سلیقے سے چنی چنائی، حلوائی کی دکان شہد وشکر کی کان، تھالوں میں مٹھائی اور اس پر ورق نقرہ، گاہک پر گاہک آرہے ہیں۔ افیمی پر افیمی ٹوٹے پڑتے ہیں۔ گوٹے والوں کی دکانوں پر بھیڑ بھڑکا ہے۔ کوئی لالہ سے مول تول کرتا ہے۔

کوئی منیب جی سے چکاتا ہے۔ صرافے میں کھنا کھن اور چھناچھن کی آوازیں آتی ہیں۔ دور تک دکان کی قطار ہے اور ہر دکان میں اشرفیوں کا انبار ہے اور جو ہے وہ کامل عیار ہے۔ زبان حال وقال سے پکار رہے ہیں کہ شرف الانسان باکمال لا بالکمال۔ دلالوں کی چاندی ہے دو ایک گاہک مل گئے تو پو بارہ ہیں۔ بازار بھر میں کھڑے چکر لگا رہے ہیں۔ اس سرے سے اس سرے تک تاکتے جا رہے ہیں۔ جوہری کی دکانچۂ جواہر نگار میں جواہرت کے ڈھیر لگے ہیں۔ لالہ پنا مل کے دماغ ہی نہیں ملتے۔ جواہر رنگارنگ اور جواہر شاہوار و لالی آبدار دیکھ کر میاں آزاد کی آنکھیں کھل گئیں۔ لعل گرانمایہ کے نور و صفا سے چکاچوندھ کا عالم ہے کہیں یاقوت رمانی کہیں زمرد سبز ریحانی۔ بزاز سراپانان کی دکان پر وہ متاع دلفریب ہے کہ واہ جی واہ۔ انگریزی، ہندوستانی، شربتی، جامدانی جس قسم کا کپڑا چاہو لے لو۔ چھینٹ، ڈوریہ، اطلس، قاقم، سنجاب، بانات، ہر قسم کا کپڑا موجود۔ مگر بابا مول دس روپیہ گز کہیں تو تین روپیہ کو بیچیں۔ شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ باد صبا کو بھی دقت سے بار ملتا تھا۔ مسجدوں کو دیکھا تو چھتیں پھٹی پڑتی ہیں۔ ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع ہیں نمازی تلاوت قران میں مصروف۔ خیر اس طرف کے لطف تو انہوں نے خوب اٹھائے۔ اب دوسری شب کو امین آباد کی سرا میں آئے۔ اللہ اللہ! کیا شہر غدار ہے!! کوسوں تک آباد، کروروں مکان، پدموں آدمی، سنکھوں باشندے، اللہ اللہ! اور لوگ

کہتے ہیں کہ شاہی میں اور بھی زیادہ آبادی تھی۔ صدر بازار اور امین آباد میں وہ رونق ہے کہ وہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ مکانات بھی عمدہ اور پختہ بنے ہیں۔ عمارات عالیشان بنگلے صاف شفاف۔ اور باغ اس کثرت سے ہیں کہ اس سرے سے اس سرے تک باغ ہی باغ نظر آتے ہیں۔ سکندر باغ سبزہ زار ہی سبزہ زار ہے۔ بادشاہی باغ سراپا بہار ہے۔ الغرض میاں آزاد اور خوجی نے یہاں خوب لطف اٹھایا۔

ہمارے رنگیلے جوان میاں آزاد اور ان کے سیلانی یار جانی میاں خوجی نے لکھنؤ میں خوب سیر گشت کی۔ خصوصاً لکھنؤ کی عالیشان کوٹھیاں اور خوشنما و دلکش بنگلے اور شاہی ایوان اور امرا کی بارہ دریاں ایسی بھائیں کہ عش عش کرنے لگے۔ محمد و طبلچی کو طبلہ بجانے میں استاد پایا تو خوش الحانی میں صادق علی خاں کو بار بُدنژاد پایا۔ باباجی نے وہ ستار بجایا کہ تان سین کو انگلیوں پر نچایا۔ فرنگی محل ہے یا خطۂ یونان یا علما فضلا کی کان۔ جو عالم ہے کملا کی جان و روح، معزز ممدوح۔ جو بلیغ ہے امراء القیس ثانی ہے۔ رشک جالینوس یونانی ہے۔ اطبا میں ایک سے ایک برق حکیم مرزا محمد جعفر کی طبابت کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ ھوالشافی نسخے میں لکھنے بھی نہ پائے کہ مریض نے صحت کامل پائی اور شفائے عاجل۔ حکیم سید محمد خاں صاحب کے مجربات علوی خاں دہلوی کے مجربات سے کم نہیں۔ معقولات

میں استاد مسلم الثبوت۔ خوش مذاق زندہ دل سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں۔ حکیم مرزا محمد حسین صاحب اور حکیم محمد ابراہیم صاحب کے گھرانے نے وہ دستگاہ کامل بہم پہنچائی کہ اودھ بھر میں شہرت پائی۔ دور دور تک نام ہوا۔ جو مریض ان سے رجوع لایا فائز المرام ہوا۔ شعرا بھی باکمال ہیں۔ تدبیر الدولہ منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی اصناف سخن پر قادر، علم عروض کے ماہر بڑے شاعر غرا۔ سخندان بیہمتا ملک الشعرا ہیں۔ اگلے شاعروں میں اب یہی تو باقی رہ گئے ہیں۔ خدا خضر و الیاس کی عمر عطا کرے۔ گو بوڑھے ہو گئے مگر طبیعت جوان ہے۔ ایک ایک شعر سے سچا لطف شاعری ٹپکتا ہے۔ جو سنتا ہے احسنت و مرحبا کہتا ہے اور داد سخن دیتا ہے۔ آفتاب الدولہ قلق اس زمانے میں غنیمت ہیں۔ ناسخ مبرور و مغفور کا نام انہوں نے خوب روشن کیا۔ مثنوی فصاحت محتوی وہ تصنیف کی کہ قلم توڑ دے۔ کیا صاف روزمرہ، کیا طرز بیان ہے۔ کیا بول چال، کیا زبان ہے۔

الغرض جس گلی کوچے کو دیکھتے ہیں کان علم، جان علم، روح و روان علم ہے۔ چوک میں سیر کرنے گئے تو بے اختیار بول اٹھے۔

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے
نظر کوئی نہ کوئی اچھی صورت آہی جاتی ہے

ایکدم پہلوانوں کی کشتی اور پھیتیوں کی دھینگامشتی

اور بنکتیوں کی کثرت اور پھنکیتوں کے کرتب اور نوٹیوں کے کمال دیکھے تو گردن ہلائی کہ ہاں ابھی بانکوں سے لکھنؤ خالی نہیں ہے۔ گتکا ٹیکا اور یہ ہو رہے۔ گتکا ٹیکا اور وہ اچک گئے۔ تراش خراش کا بھی لکھنؤ پر خاتمہ ہے۔ میاں آزاد اور خوجی لطف تماشا دیکھتے ہوئے چلے جاتے تھے تو اثنائے راہ میں ایک صاحب نئی وضع اور انوکھی قطع کے نظر سے گذرے۔ حیرت ہوئی کہ الٰہی یہ کس فشن کے آدمی ہیں بالکل نئی گڑھت ہے۔ اب ان حضرت کی قطع ملاحظہ فرمائیے کہ از سرتا پا زردا زرد۔ ڈھیلے پائیچوں کا پاجامہ زعفرانی، کیچل لیٹ کا تین کمر توئی والا انگرکھا کیسری، دو پلی نکے دار ٹوپی، بسنتی کاندھوں پر بہت بڑا چھپکے کا رومال، عشاق زار کے چہرے کی رنگت اور ان سب میں لچکا ٹکا ہوا ماشا اللہ! سن شریف چہل و شش۔ نازم بایں ریش و فش

آزاد۔ کیوں بھئی خوجی بھلا بھانپو تو یہ کس ولایت کے ہیں۔

خوجی۔ خراسانی سے معلوم ہوتے ہیں۔ یا کابل کے ہوں۔

آزاد۔ کابلیوں کی یہ قطع کہاں؟

خوجی۔ واہ کیا خوب سمجھے۔ اے میاں کیا کابل میں نہیں ہوتے۔

آزاد۔ (قہقہہ لگاکر) ذرا حضرت کی چال تو دیکھئے گا۔ کیسے کندھے جھاڑتے ہوئے پوقدمے چلے جاتے ہیں۔

اور کبھی پاپوش زریں ٹاٹ بافی اوگی پر نظر ھے۔ کبھی رومال پھڑکاتے ھیں۔ کبھی انگرکھا چمکاتے ھیں۔ کبھی لچکے کی جھلک دکھاتے ھیں۔ چمکتے ھوئے چلے جاتے ھیں۔ اس ڈاڑھی موچھ کا بھی خیال نہیں۔ یہ لمبی ڈاڑھی خرگوش کی جہاڑی اور یہ اچکے کی گوٹ۔ لاحول ولا قوۃ.

خوجی۔ آپ کو واللہ ذری چھیڑے تو دلگی ھی سہی۔

آزاد۔ یاحضرت آداب عرض ھے۔ واللہ آپ کے لباس فاخرہ پر تو وہ عالم ھے کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی ھے۔ پائے نظر پھسلا جاتا ھے۔

زرد پوش۔ (شرما کر) جی ایک وجہ خاص ھے۔

آزاد۔ وجہ خاص کیا؟ کیا کسی سرکار سے وردی ملی ھے۔ یا سچ کہنا استاد کسی نائی سے تو نہیں چھین لائے ھو۔

زرد پوش۔ (اپنے خدمتگار سے) رمضانی ذری بتا تو دینا۔ ھمیں اپنے منہ سے کہتے ھوئے شرم آتی ھے۔

رمضانی۔ حضور میاں کا نکاح ھونے والا ھے۔ مانجھے کے کپڑے پہنے ھیں۔ رسم ھے حضور۔

آزاد۔ لاحول ولا قوۃ۔ رسم کی ایک ھی کہی۔ کہاں کی رسم۔ کہنے لگے رسم ھے۔ واہ اچھی رسم ھے۔ یہ بدعت ھے یا رسم ھے۔ ڈاڑھی موچھ والے آدمی اور لچکا بنت پٹھا لگا کر کپڑے پہنے ھیں۔ معاذ اللہ۔ بھائی یہ دلھن کے لئے ھیں

یا آپ سے مچھاکڑ بیک کے لئے۔ واسطے خدا کے ان کپڑوں کو اتارو مردوں کی پوشاک پہنو لاحول ولاقوۃ۔

زردپوش۔ یہ تو سب ہی پہنتے ہیں۔

خوجی۔ اجی کون سب پہنتے ہیں۔ ذری ہم سے چار آنکھیں کیجئے۔ ہاں صاحب کون سب پہنتے ہیں۔ آخر آپ نے کن سب کو دیکھا ہے۔ ہم کو سکھاتے ہو۔ تمہارے ہی سے دو چار زنان منتری پہنتے ہوں گے۔ ورنہ باوضع اور سنجیدہ اور متشرع لوگ تو ایسی وضع کے قریب جانا داخل گناہ سمجھتے ہیں۔

آزاد۔ ارے یار تم کو شرمانا چاہئے یا بررنا چاہئے استغفر اللہ آپ اور اکڑتے جاتے ہیں۔ شاباش بےحیا کی بلا دور۔

میاں آزاد اور خوجی آگے بڑھ گئے۔ اور حضرت زردپوش اور انکا خدمتگار صاحب تن و توش ایک گلی میں کترا گئے۔ تو راہ میں خدمتگار نے یوں سمجھانا شروع کیا۔

خدمتگار۔ میاں سچ تو کہتے تھے۔ ذری دل میں سوچئے تو۔ جس گلی کوچے سے آپ نکل جاتے ہیں لوگ تالیاں بجاتے ہیں۔ انگلیاں آپ پر اٹھاتے ہیں اور قہقہہ لگاتے ہیں۔

زردپوش۔ ہنسنے دوجی۔ ہنستے ہی گھر بستے ہیں۔

میاں آزاد اور میاں خوجی راہ میں باہم قہقہہ اڑاتے

رسوم مذموم هند پر نفریں کرتے اور لاحول پڑھتے ہوئے جارہے تھے تو ایک وضعدار اور طرحدار جوان سے انہوں نے پوچھا کہ کیوں حضرت جب آپ کی شادی ہوئی تھی تو زرد کپڑے آپ نے بھی پہنے تھے۔ اس نے کہا لاحول ولاقوۃ۔ یہ زنان منتریوں کو مبارک رھیں یہاں دو آنگل ہردم میان سے باھر رھتی ھے۔ آپ نے کسی زنان منتری کو دیکھا ہوگا کہیں کسی اور سے یہ سوال نہ کر بیٹھئے گا۔ اور مشفق رسموں کی نہ کہئے۔ بعض یہاں کے آدمیوں کی یہ رسم ھے کہ دلہن کا جوتا دولہا کی کھوپڑی پر تڑ سے لگاتے ھیں جو دولہا ثقہ ھوا تو خیر جوتی چھوادی اور جو وہ بھی ٹھٹھوں ھنسوڑ بگڑے دل ھوئے تو پھر وہ اور انکا سر۔ اور گرگابی۔ مگر بانکے آدمی تو سر کاٹ کر پھینک دیں۔

اتنے میں کیا دیکھتے ھیں کہ ایک دکڑی سامنے سے آرھی ھے۔ بڑی بیش بہا فٹن۔ دوکمیت دورکابی گھوڑیاں جتی ھوئی ھیں۔ دونوں برق۔ ھوا پیچھے رھے وہ آگے جائیں۔ شیر گردوں کو طرارہ بھر کے ٹاپیں مار آئیں۔ کوچمین سبز مندیل کھوپڑی پر جمائے ھوئے کوچ بکس پر بیٹھا ھوا ھائیٹ ھائیٹ کر رھا ھے۔ اور تین نوجوان رئیس بڑے ٹھسّے اور کروفر سے بیٹھے ھیں۔ تینوں عینک باز تینوں طناز اور خوش انداز۔ شان ریاست جبین جبین سے عیاں۔ طنطنۂ امارت چھرۂ نورانی سے نمایاں۔ اتنے میں ایک اور بکٹٹ بگھی گھڑگھڑاتی ھوئی

سامنے سے آئی۔ دو نوجوان رئیس بصد شان و آن بان متمکن ھیں مگر دونوں عینک باز۔ سونے کی تیلیاں اور نازک تال اس کے بعد تین چار گھوڑوں پر سوار جوان اور گلفام نظر سے گذرے۔ کوئی جماتا ھے۔ کوئی قدم دکھاتا ھے۔ کوئی گڑگڑاتا ھے۔ کوئی چمکاتا ھے۔ ان میں بھی دو عینک باز تب تو میاں خوجی نے کہا کہ کیوں بھیا خوجی میاں یہ عینک کا فشن نیا دیکھنے میں آیا جسے دیکھو عینک باز۔ یہ دانا بینا آدمی اور اندھے بننے کا شوق چرائے! بینا سے نابینا بن جائے!! لاحول ولا!!! خوجی بولے کہ اجی ابھی آپ نے دیکھا ھی کیا ھے۔ اس کو بھی جوان عاشق تن ایک سجاوٹ اور بناوٹ سمجھتے ھیں اور چار دن میں دیکھ لیجئے گا رنگین طبع آزاد مزاج عورتیں بھی عینک چڑھانے لگیں گی یہ تو فشن ھے بھئی۔

(فسانہ آزاد جلد اوّل)

شبلی نعمانی

مامون کا ذوق علمی

اگرچہ خاندانی جھگڑے، پر زور بغاوتیں، روم کی مہمات، بارانتظام، اتنے کام تھے۔ جو مامون کے روزانہ اوقات اور دل و دماغ کو مصروف رکھتے تھے تاہم اس کے علمی ذوق پر غالب نہیں آسکتے تھے۔ جب وہ مصر گیا تو ایک شخص نے اس کو مبارکباد دی کہ آج عراق، حجاز، شام، مصر سب آپ کے زیرنگیں ھیں۔ اور رسول اللہ کے ابن عمر ہونے کا شرف ان سب پر مستزاد ھے۔ مامون نے کہا ھاں مگر یہ آرزو ھنوز باقی ھے کہ مجلس عام میں شایقین حدیث جمع ہوں اور مستملی میرے سامنے بیٹھا ہو اور کہے کہ ھاں وہ کیا حدیث ھے۔ میں بیان کرنا شروع کروں کہ حماد نے یہ روایت کی الخ۔ بچپن میں وہ اسلامی علوم کو حد کمال تک حاصل کر چکا تھا۔ اب فلسفہ پر مائل ہوا۔ اور دن رات اسی تذکرے میں بسر کرتا تھا اس کے علمی ذوق کا اندازہ اس سے ہوسکتا ھے کہ اس کی آستینوں پر اقلیدس کے مقالہ اولی کی شکل پنجم کا طغرا بنا ہوا تھا کیونکہ یہ شکل اس کو نہایت مرغوب تھی۔ اسی وجہ سے عربی میں پانچویں شکل کو شکل مامونی کہتے ھیں۔ غالبا مامون کے سوا اور کسی بادشاہ اسلام کو یہ فخر نہیں حاصل ھے کہ اس کے نام سے کوئی علمی اصطلاح قائم ہوئی ہو۔

ہارون الرشید کا قائم کیا ہوا بیت الحکمۃ موجود تھا جس میں پارسی، عیسائی، یہودی، ہندو مترجمین نوکر تھے۔ اور فنون حکمت کے متعلق تصنیف اور ترجمے کرتے رہتے تھے لیکن ابتک جو سرمایہ جمع ہوا تھا وہ مامون کے شرق علمی کے لئے کافی نہ تھا۔

ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک محترم شخص تخت پر جلوہ فرما ہے۔ مامون نے نزدیک جاکر پوچھا «آپ کا اسم مبارک» تخت نشین نے کہا «ارسطو»۔ مامون پر خوشی کی ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ پھر عرض کیا کہ «حضرت دنیا میں کیا چیز اچھی ہے» خیالی ارسطو نے جواب دیا «جس کو عقل اچھا کہے»۔ دوبارہ مامون نے درخواست کی کہ مجھکو کوئی نصیحت ارشاد ہو۔ جواب ملا کہ توحید»۔ اور صحبت نیک ہاتھ سے نہ دینا۔

مامون یونہی فلسفہ پر مٹا ہوا تھا۔ ارسطو کی زیارت نے آگ پر روغن کا کام دیا۔ اس نے قیصر روم کو خط لکھا کہ «ارسطو کی جس قدر تصانیف مل سکیں دارالخلافہ کو روانہ کی جائیں» یہ وہ زمانہ تھا کہ بادشاہان اسلام کے معمولی خطوط قیصر و فغفور پر فرمان کا اثر رکھتے تھے۔ قیصر تعمیل ارشاد پر مستعد ہوا۔ مگر روم کے اطراف میں فلسفہ خود گمنام ہوچکا تھا۔ بڑی تلاش سے ایک راہب ملا جس سے پتہ چلا کہ یونان میں ایک مکان ہے جو قسطنطین کے زمانہ سے مقفل

ھے اور جتنے تاجدار اس کے بعد تخت نشین ہوئے قفلوں کی تعداد بڑھاتے گئے۔ قسطنطین نے فلسفہ کی تمام کتابیں ہر جگہ سے جمع کر کے اس مکان میں جمع کرا دی تھیں کہ اگر فلسفہ و حکمت کو آزادی دی تو دین عیسوی کو سخت صدمے اٹھانے پڑیں گے۔

راھب کی ہدایت پر یہ پُرخطر خزانہ کھولا گیا تو بہت سی کتابیں محفوظ ملیں۔ لیکن قیصر کو اب یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کے ساتھ ایسی فیاضی مذہباً ممنوع تو نہ ہو۔ ارکان دولت نے متفق اللفظ عرض کیا کہ کچھ مضائقہ نہیں فلسفہ اگر ملسمانوں میں پھیلا تو ان کے مذہبی جوش کو ٹھنڈا کر کے رہے گا۔" قیصر نے بھی یہی مناسب سمجھا اور پانچ اونٹ لادکر خاص فلسفہ کی کتابیں مامون کے پاس روانہ کیں۔ مامون نے تصنیفات ارسطو کے ترجمہ پر یعقوب بن اسحق کندی کو معمور کیا جو مختلف زبانوں کے جاننے اور تحقیقات علمی میں عموماً بےنظیر مانا جاتا تھا۔ مامون نے خود بھی حجاج بن المطر یوحنا بن البطریق۔ سلما کو جو بیت الحکمۃ کے مہتمم اور افسر تھے اس غرض سے روم بھیجا کہ اپنی پسند سے کتابیں انتخاب کر کے لائیں۔ آرمینہ، مصر، شام، سیپرس اور دوسرے مقامات میں بھی قاصد بھیجے اور لاکھوں روپے عنایت کئے کہ جس قدر صرف سے اور جس طرح ممکن ہو فلسفی تصنیفات بہم پہنچائیں۔ اسی زمانہ میں قسطا بن لوقا

ایک عیسائی فلاسفر اپنے شوق سے روم گیا۔ اور فنون حکمت کی بہت سی کتابیں بہم پہنچائیں۔ مامون کو اس کا حال معلوم ہوا تو بلا بھیجا اور بیت الحکمۃ میں ترجمے کے کام پر مقرر کیا۔ سہل بن ہارون کو جو ایک فارسی النسل حکیم تھا مجوسیوں کے علوم و فنون کے ترجمے کی خدمت دی۔

مامون کی التفات اور توجہ دیکھ کر تمام دربار میں جوش پھیل گیا۔ محمد و احمد و حسن نے جو مامون کے خاص ندیم اور ھندسہ حیل موسیقی میں استادِ وقت مشہور تھے روم کے اطراف میں بہت سے ایلچی بھیجے اور فنون حکمیہ کی ہزاروں کتابیں منگائیں دور ودراز ملکوں سے مترجم بلوائے اور بیش قرار مشاہروں پر ترجمہ کرنے کے لئے نوکر رکھا جبرئیل بن بختیشوع المتوفی سنہ ۲۱۵ھ جو ایک عیسائی طبیب اور دربارخلافت کا بڑا رکن تھا اس نے بھی ترجمہ کے کام میں بڑی فیاضیاں دکھائیں۔

ھارونی و مامونی فیاضیوں نے مال و دولت کے اعتبار سے اس کو ایک مستقل والی ملک بنا دیا تھا۔ جن بادشاھوں سے دوستانہ تعلق تھا چونکہ مامون کا میلان طبیعت اسی طرف پاتے تھے۔ اسی مذاق کے تحف وھدایا بھیجتے تھے ھندوستان کے ایک راجہ نے اپنی ریاست کے مشہور حکیم دربان کو اس کی خدمت میں بھیجا اور خط میں لکھا کہ جو ھدیہ آپکی خدمت میں روانہ کرتا ہوں دنیا میں اس سے بڑھ کر مفید

اور نامور اور معزز تحفہ نہیں ہوسکتا۔ اس حکیم سی کنے طرح معلوم کیا تھا کہ ایوانِ کسرے میں ایک صندوق مدفون ھے جس میں نوشیرواں کے وزیر کی ایک نہایت بے مثل تصنیف چھپاکر رکھی گئی ھے۔ مامون سے کہہ کر اس نے صندوق منگوایا، کھولا گیا تو دیبا کے ٹکڑے میں لپٹا ہوا قریباً سو ورق کا ایک رسالہ ملا۔ مامون نے اس کا ترجمہ سنا تو نہایت متاثر ہوا۔ اور فضل بن سہل سے مخاطب ہوکر کہا کہ خدا کی قسم کلام اسکو کہتے ھیں وہ نہیں جو ھم لوگ کیا کرتے ھیں۔

مامون جس قدر فلسفہ کے دلچسپ مسائل سے آگاہ ہوتا گیا اسکے شوق تحصیل کو اور ترقی ہوتی گئی۔ اور زیادہ تر تحقیق و تجربے پر مائل ھوا۔

علم جبر و مقابلہ پر اسلام میں جو اوّل کتاب لکھی گئی وہ اس عہد کے ایک مشہور عالم محمد بن موسیٰ خوارزمی نے مامون کی فرمائش سے لکھی۔ یہ تصنیف آج بھی موجود ھے اور اس قدر جامع و مرتب ھے کہ گو علماے اسلام نے جبر و مقابلہ میں سینکڑوں نادر کتابیں لکھیں لیکن اصل مسائل میں اس سے زیادہ ترقی نہ کرسکے۔ یونانی کتب حکمت میں اس نے پڑھا تھا کہ کرۂ زمین کا دور ۲۴ ھزار میل ھے۔

دولت اسلامیہ میں اوّل جس نے رصدخانہ کی بنیاد ڈالی اور بیش بہا آلات رصدیہ مہیا کئے وہ یہی نامور خلیفہ مامون

ھے اس کام کے لئے اس نے علاوہ ان لوگوں کے جو دربار میں تھے تمام ممالک محروسہ سے ہیئت و ھندسہ کے ماھرین فن طلب کئے اور سنہ ۲۱۴ھ میں بمقام شماسیہ عظیم الشان رصدخانہ قائم کیا جس کے مہتمم یحییے ابن ابی المنصو، راس المنجمین خالد بن عبدالملک مروروذی، سند بن علی، عباس بن سعید جوھری اور چند ریاضی دان علماء تھے۔ نہایت بیش بہا آلات رصدیہ تیار ہوئے۔ اور آفتاب کے میل کا مقدار۔ اس کے مرکزوں کا خروج اوج کے مواضع اور چند سیارات و ثوابت کے حالات دریافت کئے گئے۔

ایشیائی حکومتوں میں کسی چیز کی اشاعت کے لئے صرف یہ بات کافی ھے کہ فرمانروائے وقت اس کا قدردان ھو لیکن مامون کے عہد میں چند اور باتیں جمع ھوگئی تھیں۔

اس وقت تک مسلمانوں میں عزم و ثبات کا عام مادہ موجود تھا اور ھرشخص کا دل جوش اور امنگ سے لبریز تھا۔ یہ سرگرم طبیعتیں جس طرف رخ کرتی تھیں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتی تھیں اس کے ساتھ مامون کی پایہ‌شناسی اور فیاضیوں نے اور بھی حوصلے بڑھادئے اور چونکہ مامون خود نہایت محقق اور ماھرفن تھا اور اس کے دربار میں فروغ پانا کچھ آسان بات نہیں تھی۔ ملک میں کمال کا عام رواج ھوگیا۔

عبدالحلیم شرر

بادسحر

یاد آئے اگر مجھکو چمن کنج قفس میں
دامن میں لئے پھول نسیم سحر آئے

صبح خیزان مسجد بہت تڑکے آٹھے اور مذہبی فرائض کے ادا کرنے کی جانب نہایت سرگرمی سے متوجہ ہوگئے۔ انہوں نے جس چراغ کو غلبۂ تاریکی کے وقت طاق مسجد میں روشن کیا تھا آسے کچھ خوشگوار سی ہوا کے جھونکوں سے تھپیڑے کھا کھا کے اور اپنی دلفریب نورانیت کو کھو کھو کے یا مختصر یوں کہ جھلملا جھلملا کے گل ہوجاتے دیکھا۔ اور یا یہ دیکھا کہ صبح کی بیباك ہوا کسی جھونکے لینے والے رندمیکش کی طرح لڑکھڑاتی ہوئی مسجد میں گھس آئی اور حضرت شیخ کے ایسے خشك مزاج بزرگ کے ساتھ بھی یہ بےادبی کی شوخیاں کرنے لگی کہ آنکی سفید، نورانی اور لمبی ڈاڑھی ادھر آدھر آڑی جاتی ہے۔ وہ داب ووقار کی اداؤں سے رك رك بلکہ لوگوں کی آنکھ بچا بچا کے اسے روکتے ہیں۔ مگر وہ ہمارے دل ازخود رفتہ کی طرح آن کے ہاتھ سے نکلی جاتی ہے۔ اس کے سوا اور کیا تھا جو انہوں نے دیکھا۔ صبح کے نقیب یعنی طیورنغمہ خوان نے انہیں بہت پکارا۔ نسیم مستانہ رو نے بڑی شوخ ادائیوں سے اس وقت

بھی جب وہ وضو کر رہے تھے اور اس گھڑی بھی جب وہ نماز میں مصروف تھے آنکے پہلوؤں میں بہت ٹہوکے بتائے۔ مگر انکے دل میں اتنی حس کہاں کہ قدرت کی اصلی بہار کو دیکھیں اور سبحان اللہ کہیں۔ یہ کلمہ انکی زبان سے بے شک سنا گیا اور بارہا سنا گیا۔ مگر موجودہ وقت کی دلچسپیوں اور عروس قدرت کی نازآفرینیوں پر نہیں بلکہ حوروں کی تمنا اور جنت کی آرزو میں۔ اس اعتراض کو لوگ فضول نہ سمجھیں۔ خشک طبعان بوالہوس پر یہ سچا اعتراض ھے کہ انہوں نے قدرت کی موجودہ دلچسپیوں کی قدر نہ کی۔ صرف آئندہ لطفوں کو یاد کرتے رہے۔ صبح جو باغ قدرت کے نکھار کا وقت تھا اس وقت یہ اٹھے مگر آس وظیفہ میں مشغول ہوگئے جسے اور وقت بھی پڑھ سکتے تھے۔ یہ غیرممکن نہ تھا جو اس وقت یہ صفحات قدرت کا مطالعہ کرنے کے لئے وقت نکالتے۔ خدا کی بہت بڑی عبادت یہی ھے کہ اسکی قدرت کو دیکھ کے انسان اپنی مخلوقیت کا سبق حاصل کرے۔

یہ نسیم سحر جو صبح کو متوالی بن بن کے چلتی ھے اور جس کی کیفیتیں اس درجہ مؤثر ھیں کہ نوجوانان چمن جو قدرتی طور پر یا خودپسندی کے غرور میں بالکل بے حس بنے ہوئے ھیں آن پر بھی ایک ایسا بیخودی کا عالم طاری ہوتا ھے کہ وجد میں آ آ کے مشغول رقص ہوجاتے ھیں۔ نوجوانان چمن درکنار عروسان گلشن یعنی نازک اور دلفریب

پھول جن کی متانت کی ھنسی مشہور ھے آنہیں بھی جوش مسرت میں ضبط نہیں ھوسکتا اور کسی طرح اپنے نازک اور خوشرنگ لب بند نہیں رکھ سکتے۔ ان بےحسوں کا تو یہ حال ھے اور انسانی دماغ کے عقلانے اپنی عقلوں کو اس قدر غیرمتأثر بنا دیا ھے کہ وہ باخبر بھی نہیں ھوتے اور نسیم سحر دنیا میں ایک زندگی بخش سماں پیدا کرکے رخصت ھوجاتی ھے۔

کوھستانی سبزہ زار جنکی چوٹیاں صبح کے سناٹے میں شبنم سحر کے دھوئے ھوئے آسمان کی صورت دیکھنے میں ایسی محو ھوتی ھیں کہ گویا اور کسی طرف دیکھنا چاھتی ھی نہیں، ان کے ھر درخت، بلکہ انکو لباس زمردیں پہنانے والی گھاس کی ھر پتی کے حیرتمندانہ سکوت سے معلوم ھوتا ھے کہ وہ ایک بالکل سناٹے اور محویت کے عالم میں ھیں۔ ازخود رفتگی نے ان پر ایک سکتے کا عالم طاری کر دیا ھے۔ یہ نسیم اس وقت کی خفیف روشنی میں جب پچھلی رات کے آسمان پر تاروں کے چراغ گل کرنے اور ان میں ایک مزیدار جھلملاھٹ پیدا کرنے کے لئے اوپر چڑھتی ھے تب دیکھئے کہ ان ازخود رفتہ قلہ ھائے کوہ کو اس خواب حیرت سے جگانے کے لئے یہ کن مستانہ لغزشوں اور شوخ اداؤں سے ان کے دامن میں ادھر آدھر گدگداتی ھوئی جاتی ھے اور کس کس طرح بیتاب کرکے انہیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاھتی ھے۔

نسیم ان کوششوں میں ناکام نہیں رہتی۔ اسے کامیابی بلکہ بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ اسکی ان شوخ ادائیوں کے نتیجے میں صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس نے قدرت کے ارگن کو کوک دیا اور ہر چہار طرف سے نیچر کے ایجاد کئے ہوئے نغمے سنے جانے لگے۔ خوش نوا اور آزادطبع طیور جو اس حصۂ دنیا کے نشیب وفراز میں شب باش ہوا کرتے ہیں۔ درختوں کی حرکت انہیں جگاتی ہے اور وہ چونک چونک کے خدا کی مناجات اور قدرت کی خوبیوں کے شادیانے شروع کر دیتے ہیں۔ زاہدوں کا ہم مشرب اور شب بیدار الو تو اپنی آنکھیں بند کرکے الگ ہوجاتا ہے اور خوش مذاق و شگفتہ طبع طیور آن خدا کے بنائے ہوئے برجوں پر بیٹھ بیٹھ کے قدرت الٰہی کی نوبت بجانے لگتے ہیں۔ وہ آبشار جو رات کے سناٹے میں ایک سکوت کے ساتھ بلندی سے نیچے اترتا چلا آتا تھا اس نے اب اپنے آئینہ میں جابجا صبح کی روشنی کا نورانی عکس دکھایا ہے۔

ایک تھکا ماندہ مسافر جس طرح اپنی پرشوق رفتار میں دیکھتا ہے کہ رفتہ رفتہ دور کے دھندھلکے کا دامن چاک ہوتا جاتا ہے۔ اور وطن کی عمارتیں ساعت بساعت زیادہ ابھر ابھر کے نمایاں ہوتی جاتی ہیں۔ اسی طرح صبح کا گریباں جوں جوں چاک ہوتا ہے قدرت کے نظرفریب سامان اور زیادہ نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ متلاطم سمندر کا کنارا پرآرزو

نظروں کو دور کی سیر کرانے والا ساحل جہاں اکثر دوست آشنا، بچھڑے ہوئے، ہجراں زدہ، خدا جانے کن کن آرزوں سے نظر دوڑایا کرتے ھیں وھاں اس وقت جس وقت نسیم سحر کو آپ نے پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھتے دیکھا تھا ملاحظہ فرمائیے تو یہاں بھی باغ قدرت کے عجیب دلچسپ کرشمے نظر آئیں گے۔ وہ جہاز جس کے انتظار میں لوگ مدتوں سے چشم برہ تھے اور جس نے رات کی تاریکی میں اسٹیم کی قوت یا بادبانوں کی کشش سے اپنے سفر کی بہت مسافت طے کرلی ھے۔ اب اس وقت آن معمولی قوتوں کو نسیم سحر اور بڑھا رھی ھے۔ اور گویا مشتاقوں کے جذبات کی سفیر بن کے گئی ھے اور انہیں بڑی قوی کشش کے ساتھ کنارے کی طرف لاتی ھے۔ اس جہاز کی جستجو کرانے والی نگاھوں نے صبح کا دامن چاک ھوتے ھی اسے بہت دور پر پایا تھا۔ اس کی پہلی مٹی مٹی شکل اب زیادہ نمودار ھوگئی ھے۔ نسیم سحر اسکے استقبال میں اس درجہ سرگرم ھے کہ سمندر کو اپنے نازک جھونکوں سے بار بار تھپیڑے دیتی ھے اور کوشش کرتی ھے کہ سمندر اس جہاز کے لئے جو گویا مختلف آوازوں اور امیدوں کی مجسم تصویر ھے خود ھی جگہ خالی کردے۔ اگرچہ یہ تھپیڑے ڈھیلے ھاتھوں کی مار ھیں لیکن نافہم سمندر اسپر بھی بگڑ بگڑ کے بار بار چین بہ جبین ھوجاتا ھے۔ ان سب باتوں کی مجموعی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی ھے۔ وہ سطح آب کا جھنجلا کے چین بجبیں ھونا، وہ جہاز کا برابر آگے بڑھنا اور

وہ نسیم سحر کا بار بار اور رہ رہ کے سمندر کو چھیڑ کے الگ هوجانا ایسی لطف کی باتیں هیں که ایك صاحب حس کے نزدیك ان کی زیارت هی اوّل درجه کی عبادت ہے۔

اے پیاری خوشخرام نسیم سحر! تو قدرت کی سچی کارفرما هی نہیں نامه بر بھی ہے۔ خدا کے وهاں سے صبح کا پیام دنیا والوں کے پاس توهی لاتی ہے۔ تیری هی خوشگوار خنکی جب محسوس هوتی هے تب معلوم هوتا هے که صبح هوئی۔ غالبا تیری هی نازك انگلیوں سے دامن سحر بھی چاك هوتا هوگا اس لئے که جب کبھی تڑکے آنکھ کھلی ہے هم نے بچشم خود دیکھا ہے که آسمان پر جاکے تاروں کے چراغ توهی گل کرتی ہے پچھلے کے چاند کے چهره پر توهی وه سفید پوڈر مل آتی هے جو اسکی روشنی کو ماند کر دیتا هے اور جس کے اثر سے آخر وه ایسا غائب هوجاتا هے که دنیا بھر میں کوئی اسے نہیں دیکھ سکتا۔ چاهے وه سب کو دیکھتا هو۔ توهی باغوں میں جاکے غنچوں کو هنساتی اور نونهالان چمن کو ازخود رفته کرکے وجد میں لے آتی ہے۔ توهی سمندر کے پانی میں ایك خفیف حرکت پیدا کرکے عدم کے ایسے سناٹے کو مٹاتی ہے۔ توهی صحراؤں میں چل پھر کے ریگ رواں کو میٹھی چال چلاتی ہے۔ دنیا کے جھلملاتے هوئے چراغ اور صحبت هائے عیش کی شمعیں تیرے هی پھونکنے سے گل هوجاتی هیں اور عالم کی رات بھر کی خاموشی تیری هی شوخ ادائیوں سے دور هوتی ہے۔ توهی

آشیانوں میں جاکے طیور کو چونکاتی اور مسجدوں میں آکے زہاد کو آٹھا بیٹھاتی ہے۔

آہ! کیسی اچھی اچھی جگہ تیرا گذر ہوتا ہے اور تو کیسی کیسی لطف کی صحبتوں میں پہنچ جاتی ہے۔ تو آزادی کا نمونہ، مجنوں کا بیباک ہاتھ یا ہماری تمنا ہے۔

(مقالات شرر)

عبدالحق

مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم

آدمی کا مرنا کوئی انوکھی بات نہیں۔ لیکن ایسے شخص کی موت جس سے دس بیس نہین ہزاروں، لاکھوں بندگان خدا کی بہبودی وابستہ ہو، جس پر قوم کی رہبری اور سرداری کے لئے ملک کی نظر انتخاب ہو اور جس کی ذات سے ایسی توقعات ہوں جو اتنی بڑی قوم اور ایسے وسیع ملک میں کسی دوسرے سے پوری ہوتی نظر نہ آتی ہوں، ہزار حسرت و افسوس کے قابل ہے اور اس کا جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔

مرحوم لڑکپن سے ذہین و ذکی مشہور تھے۔ طالبعلمی کے زمانے میں بھی وہ اپنے ہمسروں مین ممتاز رہے اور آنر کے ساتھ بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور علی گڈھ کالج کے نہایت قابل اور سعید سپوتوں میں سے تھے۔

طالب علمی سے فارغ ہونے کے بعد وہ حیدرآباد آئے۔ اگرچہ ابتدا مین وہ معمولی خدمت پر مقرر ہوئے لیکن خدا داد ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے انھوں نے یہاں غیر معمولی کامیابی حاصل کی اور مددگاری ہوم سکریٹری سے ہوم سکریٹری کی معزز اور اہم خدمت پر فائز ہوئے۔ انکی کاردانی

اور کار گذاری ریاست حیدرآباد دکن میں ضرب المثل ہے۔ وہ کام کرنے میں بجلی اور محنت کرنے میں آندھی اور طوفان تھے۔ معاملات کی تہ کو اس قدر جلد پہنچتے تھے کہ جن لوگوں نے انہیں معاملات کا ہفتوں اور مہینوں مطالعہ کیا تھا وہ بھی دیکھتے رہ جاتے تھے۔ سرکاری خدمت کی کٹھن اور دشوار منزلوں کو انہوں نے ہمیشہ اس آسانی سے طے کیا کہ کبھی ان کی طبیعت پر گراں نہ گزرا۔ جو کام دوسرے لوگ آٹھ آٹھ دس دس گھنٹوں میں طے نہیں کرسکتے تھے وہ مرحوم نے دو تین گھنٹوں میں بھگتا دیا اور پھر اس دقیق نظری کے ساتھ کہ کیا مجال کوئی بات رہ جائے۔ اپنے فرائض نہایت دیانت داری اور دلچسپی کے ساتھ ادا کئے۔ نہ کبھی کام کرنے سے اکتائے اور نہ آج کا کام کل پر چھوڑا۔ جب بعض وجوہ سے وہ خدمت ہوم سکریٹری سے اول تعلقداری پر بھیجے گئے تو حالانکہ انہوں نے کبھی مال گزاری کا کام نہیں کیا تھا لیکن اپنے فرائض منصبی کو اس خوبی اور استقلال کے ساتھ ادا کیا کہ لوگوں کو حیرت ہوئی اور سرکاری رپوٹوں میں متواتر انکی کارگزاری پر اظہار خوشنودی کیا گیا۔ اور آدھر رعایا اس قدر خوش تھی کہ ہندو مسلم ان کے تبادلہ پر آنسو بہاتے تھے۔ اس کے بعد وہ مجلس عالیہ عدالت کے رکن (جج ہائی کورٹ) ہوئے اور باوجودیکہ انہوں نے کوئی قانونی امتحان پاس نہیں کیا تھا لیکن یہاں بھی وہ ممتاز رہے۔ تعلیم یافتہ شخص کے یہی معنی ہیں کہ

وہ جس کام میں ہاتھ ڈالے اسے حسن و خوبی کے ساتھ ادا کرے۔ تھوڑے ھی عرصہ کے بعد وہ پھر اسی جانگداز اور طمانیت سوز خدمت ہوم سکرٹری پر سر فراز کیے گئے۔ اس زمانے میں مرحوم نے ریاست حیدرآباد کی تعلیم پر خاصی توجہ کی اور ایک ایسا قابل تعریف نوٹ ریاست کی تعلیمی حالت پر لکھا ھے جو ہمیشہ یادگار رھے گا۔ نیز اس میں ایسی ایسی مفید تجاویز پیش کی ھیں کہ اگر آن پر کافی طور سے عمل کیا گیا تو ملک کی خوش قسمتی سمجھی جائے گی اور جب کبھی ریاست کی تعلیمی حالت میں اصلاح کا خیال پیدا ہوگا تو اسی داغ بیل پر چلنا پڑیگا۔ مرحوم کی ذھانت، قابلیت، وسعت معلومات پر ایک عالم گواہ ھے۔ باوجود کثرت کار کے علمی شوق آن کے دم کے ساتھ رہا۔ ھندوستان کے مشہور اردو رسالوں میں شاید ھی کوئی ایسا ھو جس میں ان کے بیش بہا مضامین طبع نہ ہوئے ھوں اور پبلک انھیں ہمیشہ وقعت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ مرحوم مقرر بھی تھے اور بلا تکلف تقریر کرتے تھے۔ لیکن تقریر سے زیادہ ان کی تحریر پرزور اور شاندار ہوتی تھی چنانچہ ان کے بعض مضامین اردو انشا پردازی کے بہت عمدہ نمونے ھیں مرحوم کو علم تاریخ سے خاص دلچسپی تھی۔ محمود گاواں کی سیرت پر جو رسالہ لکھا ھے اس سے ان کے تاریخی تجسس و تلاش کا پتا لگتا ھے۔ اردو ادب کا بھی انھیں ویسا ھی ذوق تھا جو وکرم آروسی (کالیداس کے ڈرامے) کے ترجمے سے صاف

ظاہر ہے۔ ریاست حیدرآباد میں کوئی علمی اور سوشل مجلس اور سوسائٹی ایسی نہ تھی جس کے وہ پریزیڈنٹ نہ رہے ہوں مثلاً دائرۃ المعارف، نظام کلب، کتب خانۂ آصفیہ، علی گڈھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، انجمن ترقی اردو وغیرہ وغیرہ سب ان سے فیضیاب تھیں۔ انجمن قایم کرنے والے یا کسی عارضی جلسے کے منعقد کرنے والے اوّل ہی سے سمجھ لیتے تھے کہ مولوی عزیز مرزا اس کے صدر ہوں گے۔ یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ مرحوم حیدرآباد کی تمام قومی، ملکی اور تمدنی تحریکوں کے روح وروان تھے اور اس کا سب سے قوی ثبوت یہ ہے کہ جب سے مرحوم حیدرآباد سے گئے ہیں حیدرآباد جیسا شہر سنسان ہوگیا ہے اور کسی قسم کی تحریک کا نام تک زبان پر نہیں آتا۔ یہ سب کچھ اس دم کے ساتھ تھا جو خود علمی ذوق اور قومی درد رکھتا تھا اور دوسروں میں اس احساس کی قدر کرتا تھا۔

اس سے بڑھ کر دوسری بات جس نے مرحوم کو عام و خاص، امیر و غریب ادنا و اعلی سب میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا ان کی وسعت اخلاق تھی۔ وہ چھوٹے بڑے سب سے یکساں خوش اخلاقی اور بشاشت سے پیش آتے تھے۔ ہر ایک کی سنتے اور نہایت بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے نخوت و رعونت چھو نہیں گئی تھی، چھوٹے چھوٹے آدمی کے ساتھ بھی وہ مساوات کا برتاؤ کرتے تھے۔ ان کا گھر پبلک کا گھر تھا اور صبح ٦ بجے سے رات کے ١١ بجے

تک لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور باوجودیکہ ان کے کاموں میں ہرج ہوتا اور بعض اوقات تکلیف ہوتی تھی لیکن وہ ضروری سے ضروری کام چھوڑ کر بھی مل لیتے تھے لوگوں کی مقصد براری اور سفارش کرنے میں بڑے دلیر تھے اور کبھی کوئی شخص ان کے در سے مایوس ہوکر نہ گیا۔ ان کی مجلس میں عموماً علمی چرچے رہتے تھے اور ہر شخص آزادانہ گفتگو کرسکتا تھا افسوس کہ ان کے جاتے ھی یہ چرچے حیدرآباد سے اٹھ گئے اور اب کوئی جگہ ایسی نہ رہی جہاں ایسی صحبت کا لطف حاصل ہوسکے۔ ظریف اور خوش طبع بھی تھے۔ ان کے مزیدار لطیفوں اور چٹکلوں کا ان کے دوست اب تک مزا لیتے ھیں ان کی مجلس سے شاذ و نادر ھی کوئی شخص ناخوش اور مایوس ہوکر آتا۔ مذہب کے بہت پابند تھے۔ کہیں ہوں اور کسی حالت میں ہوں نماز قضا نہیں ہوتی تھی۔ ان کی زندگی نہایت سادہ اور بے ریا تھی۔ اور باوجود اس جاہ و منصب اور قیام حیدرآباد کے کبھی بھولے سے بھی راحت کی طرف متوجہ نہ ہوے وہ بہت ھی متقی پرہیز گار تھے اور ہمیشہ طالب علمانہ زندگی بسر کرتے تھے ان کی طرز معاشرت پرانے اور نئے دونوں طبقے کے لوگوں کے لئے قابل تقلید تھی مرحوم بہت صاف گو تھے جو دل میں آتا فوراً زبان سے کہہ دیتے تھے اور اس صاف گوئی سے انہیں بعض اوقات نقصان بھی پہنچتا اگرچہ کبھی کبھی رنجیدہ ہوجاتے تھے لیکن پھر جلد صاف

ہو جاتے تھے۔ کبھی دل میں کینہ یا بغض نہیں رکھتے تھے
آن کا فیض عام تھا دوست دشمن بلا امتیاز اس سے متمتع
ہوتے تھے انتقام کا کبھی خیال نہ کیا بلکہ جن لوگوں نے
ان سے برائی کی انہوں نے اس کا بدلہ ہمیشہ بھلائی سے دیا
اور بیسیوں مثالیں ہمارے سامنے ایسی موجود ہیں کہ دوستوں
سے بڑھ کر انہوں نے دشمنوں کو نوازا۔ مرحوم بہت رقیق القلب
تھے۔ کسی کی درد بھری داستان سن کر خود آن کا دل بھر
آتا تھا ان کی تنخواہ کا ایک حصہ دوسروں کی دستگیری میں
صرف ہوتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس کبھی روپیہ
جمع نہ ہوا اور خالی ہاتھ اس دنیا سے کوچ کیا۔

حیدرآباد کی زندگی عجیب و غریب زندگی ہے۔ ممکن
ہی نہیں کہ یہاں کے اطراف و حوالی کا اثر انسان پر نہ پڑے
اور کچھ نہیں تو کاہل ضرور ہو جاتا ہے لیکن مرحوم کی جفا
کشی و مستعدی میں آخر دم تک فرق نہ آیا۔ وہ کبھی
راستبازی اور دیانتداری کے راستے سے نہ بھٹکے۔ ان کی زندگی
جیسی سادہ اور بے ریا پہلے تھی وہ آخر دم تک رہی اور
آن کے اتقا اور پرہیزگاری میں کبھی تزلزل واقع نہ ہوا
لیکن آخر میں حیدرآباد کی زندگی نے ایک خفیف سا نقص
خوشامد پسندی کا پیدا کر دیا تھا۔ مگر بے عیب ذات خدا
کی ہے۔ کون ہے جس میں کوئی عیب نہیں اور خاص کر
ضعف نہ ہو۔ لیکن اس عزیز مرحوم میں اس قدر محاسن
اور خوبیاں جمع تھیں کہ آج باوجود تلاش کے کوئی اس

کا جانشین نہیں ملتا۔ خصوصاً حیدرآباد میں لوگ انہیں زمانۂ دراز تک یاد رکھیں گے۔ ان کی بھلائیاں، ان کے کارنامے اور ان کے احسانات ان کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

حیدرآباد سے جانے کے بعد انہوں نے اپنی زندگی قومی کاموں کے لئے وقف کردی تھی اور آل انڈیا مسلم لیگ ان کے حوالے کردی گئی تھی۔ ان کے سکرٹری ہونے سے قبل لیگ برائے نام تھی۔ مرحوم نے اسے زندہ کیا۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں دورہ کرکے اس کے دائرہ کو وسیع کیا اور اہل کمال اس کے کاموں کی قدر کرنے لگے۔

مرحوم کی عمر پورے پچاس برس کی بھی نہ تھی کہ پیام اجل آ پہنچا۔ اب تک وہ طالبعلمی اور ملازمت کے دھندے میں گرفتار رہے تھے۔ حال میں مکروہات دنیا سے فارغ ہوکر قومی کار زار میں بڑی مستعدی سے قدم رکھا اور یقین تھا کہ وہ سب سے زیادہ کارآمد اور مفید ثابت ہوں گے۔ کیونکہ جب ایام ملازمت میں انہوں نے اس قدر نمایاں کام کئے تو بعد فراغت وہ کیا کچھ نہ کرتے۔ لیکن افسوس کہ عین وقت پر نہایت بے وقت انہیں اس دنیا سے کوچ کرنا پڑا اور ملک و قوم کی بہت سی توقعات اور آرزوئیں ان کے ساتھ خاک میں مل گئیں۔

جدید تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں پر ایک یہ اعتراض کیا جاتا ھے کہ ان میں اب تک کوئی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا جس نے پرانے بزرگوں کی طرح ملک و قوم کی خدمت

بے نفسی اور ہمدردی کے ساتھ کی ہو۔ یہ اعتراض بہت کچھ صحیح ہے اور اکثر اس کے جواب میں ہمیں ساکت ہونا پڑتا ہے۔ لیکن اب ہم بلا خوف تردید مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم کو پیش کرتے ہیں جو بالکل جدید تعلیم یافتہ تھے۔ مگر ان میں وہ تمام اوصاف موجود تھے جن کی ملک و قوم کو اس وقت سخت ضرورت ہے۔ ایام طالب علمی و ملازمت میں وہ جہاں کہیں رہے انہوں نے اپنے فرائض منصبی کو ایسی مستعدی، جفاکشی اور دیانت کے ساتھ ادا کیا کہ لوگ قائل ہوگئے اور جب قومی خدمت پر کمر باندھی تو اسے بھی خوش اسلوبی، بے نفسی اور بے ریائی کے ساتھ انجام دیا اور ثابت کردیا کہ حب وطن اور قومی درد کسی خاص طبقہ یا کسی خاص عمر پر موقوف نہیں ہے۔

قیس ہو، کوہکن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

(چند ہم عصر)

دو بیل

جانوروں میں گدھا سب سے زیادہ بیوقوف سمجھا جاتا ہے۔ جب ہم کسی شخص کو پرلے درجہ کا احمق کہنا چاہتے ہیں تو اُسے گدھا کہتے ہیں۔ گدھا واقعی بیوقوف ہے یا اس کی سادہ لوحی اور انتہا درجہ کی قوت برداشت نے اسے یہ خطاب دلوایا ہے، اس کا تصفیہ نہیں ہوسکتا۔ گائے شریف جانور ہے، مگر سینگ مارتی ہے۔ کتا بھی غریب جانور ہے، لیکن کبھی کبھی اسے غصہ بھی آجاتا ہے۔ مگر گدھے کو کبھی غصہ نہیں آتا۔ جتنا جی چاہے مارلو۔ چاہے جیسی خراب، سڑی ہوئی گھاس سامنے ڈال دو۔ اس کے چہرے پر ناراضگی کے آثار کبھی نظر نہ آئیں گے۔ اپریل میں شاید کبھی کلیل کرلیتا ہو۔ پر ہم نے اسے خوش ہوتے نہیں دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک مستقل مایوسی چھائی رہتی ہے۔ سکھ، دکھ، نفع، نقصان سے اسے شاد ہوتے نہیں دیکھا۔ رشی منیوں کی جس قدر خوبیاں ہیں سب اس میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ لیکن آدمی اُسے بیوقوف کہتا ہے۔ اعلا خصلتوں کی ایسی توہین ہم نے اور نہیں دیکھی۔ ممکن ہے دنیا میں سیدھے پن کے لئے جگہ نہ ہو۔

لیکن گدھے کا ایک بھائی اور بھی ھے جو اس سے کم ھی گدھا ھے اور وہ ھے بیل۔ کچھ لوگ ایسے بھی ھیں جو بیل کو بیوقوفوں کا سردار کہنے کو تیار ھیں۔ مگر ھمارا خیال ایسا نہیں۔ بیل کبھی کبھی مارتا ھے۔ کبھی کبھی اڑیل بیل بھی دیکھنے میں آتے ھیں۔ اور کبھی کئی طریقوں سے وہ اپنی ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار کر دیتا ھے۔ لہذا اس کا درجہ گدھے سے نیچے ھے۔

جھوری کاچھی کے پاس دو بیل تھے۔ ایک کا نام ھیرا تھا دوسرے کا موتی۔ دونوں پچھائیں نسل کے تھے۔ دیکھنے میں خوبصورت، کام میں چوکس، ڈیل ڈول میں اونچے۔ بہت دنوں سے ایک ساتھ رہتے رہتے دونوں میں محبت سی ھوگئی۔ دونوں آمنے سامنے یا ایک دوسرے کے پاس بیٹھے زبان خاموش میں ایک دوسرے سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے دل کی بات کیونکر سمجھ جاتے تھے، یہ ھم نہیں کہہ سکتے۔ ضرور ان میں کوئی نہ کوئی ناقابل فہم قوت تھی جس کے سمجھنے سے اشرف المخلوقات ھونے کا مدعی انسان محروم ھے۔ دونوں ایک دوسرے کو چاٹ کر اور سونگھ کر اپنی محبت کا اظہار کرتے تھے۔ کبھی دونوں سینگ ملا لیا کرتے تھے۔ عناد سے نہیں، محض زندہ دلی سے۔ محض ھنسی مذاق سے، جیسے یار دوستوں میں کبھی کبھی دھول دھپا ھوجاتا ھے۔ اس کے بغیر دوستی کچھ پھیکی اور ھلکی سی رہتی ھے جس پر زیادہ اعتماد نہیں۔

کیا جا سکتا۔

جس وقت یہ دونوں بیل ھل یا بیل گاڑی میں جوتے جاتے اور گردنیں ھلا ھلا کر چلتے تو ھر ایک کی یہی کوشش ھوتی تھی کہ زیادہ بوجھ میری ھی گردن پر رھے۔ کام کے بعد دوپہر یا شام کو کھلتے تو ایک دوسرے کو چوم چاٹ کر اپنی تکان اتار لیتے۔ ناند میں کھلی بھوسا پڑ جانے کے بعد دونوں ایک ساتھ اٹھتے، ایک ساتھ ناند میں منھ ڈالتے اور ایک ھی ساتھ بیٹھتے۔ ایک منھہ ھٹا لیتا تو دوسرا بھی ھٹا لیتا تھا۔

ایک مرتبہ جھوری نے دونوں بیل چند دنوں کے لئے اپنی سسرال بھیجے۔ دونوں بیلوں کو کیا معلوم کہ وہ کیوں بھیجے جاتے ھیں۔ سمجھے مالک نے ھمیں بیچ دیا۔ کون جانے بیلوں کو اپنا بیچا جانا پسند آیا یا نہیں۔ لیکن جھوری کے سالے کو انھیں اپنے گاؤں لے جانے میں دانتوں پسینا آ گیا۔ پیچھے سے ھانکتا تو دونوں دائیں بائیں بھاگتے۔ آگے سے پکڑ کر کھینچتا تو دونوں پیچھے کو زور لگاتے۔ مارتا تو دونوں سینگ نیچے کر کے پھنکار مارتے۔ اگر ان بے زبانوں کے زبان ھوتی تو جھوری سے پوچھتے: تم نے ھم غریبوں کو کیوں نکال دیا؟ ھم نے تمھاری خدمت کرنے مین کبھی کوتاھی نہیں کی۔ اگر اتنی محنت سے کام نہ چلتا تھا تو اور کام لیتے۔ ھم کو انکار نہ تھا۔ ھمیں تمھاری خدمت میں مر جانا بھی قبول تھا۔ ھم نے کبھی دانے چارے کی شکایت نہیں کی۔

تم نے جو کچھ کھلایا وہ سر جھکا کر کھا لیا۔ پھر تم نے ہمیں اس ظالم کے ہاتھ کیوں بیچ دیا؟

شام کے وقت دونوں بیل گیا کے گانو میں جا پہنچے۔ دن بھر کے بھوکے تھے، لیکن جب ناند میں لگائے گئے تو کسی نے بھی اس میں منھ نہ ڈالا۔ دونوں کا دل بھاری ہو رہا تھا۔ جسے انھوں نے اپنا گھر سمجھا تھا وہ آج ان سے چھوٹ گیا۔ یہ نیا گھر، نیا گانو، نئے آدمی سب انھیں بیگانے لگتے تھے۔ دونوں نے چپ کی زبان میں کچھ باتیں کیں۔ ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا اور لیٹ گئے۔

جب گانو میں سوتا پڑ گیا تو دونوں نے زور مار کر پگھے تڑالئے اور گھر کی طرف چلے۔ پگھے مضبوط تھے۔ کسی کو شبہہ بھی نہ ہوسکتا تھا کہ بیل انھیں توڑ سکیں گے۔ پر ان دونوں میں اس وقت دگنی طاقت آگئی تھی۔ ایک جھٹکے میں رسیاں ٹوٹ گئیں۔

جھوری نے صبح اٹھ کر دیکھا کہ دونوں بیل چرنی پر کھڑے تھے۔ دونوں کی گردنوں میں آدھا آدھا رسا لٹک رہا تھا۔ گھٹنوں تک پاؤں مین کیچڑ بھرے ہوئے تھے اور دونوں کی آنکھوں میں محبت اور ناراضگی جھلک رہی تھی۔ جھوری انھیں دیکھ کر محبت سے باؤلا ہوگیا اور دوڑ کر ان کے گلے سے لپٹ گیا۔ انسان اور حیوان کی محبت کا یہ منظر نہایت دلکش تھا۔

گھر اور گانو کے لڑکے جمع ہوگئے اور تالیاں بجا

گھر اور گانو کے لڑکے جمع ہو گئے اور تالیاں بجا بجا کر ان کا خیر مقدم کرنے لگے۔ گانو کی تاریخ میں یہ واقعہ اپنی قسم کا پہلا نہ تھا، مگر اہم ضرور تھا۔ بال سبھا نے فیصلہ کیا کہ ان دونوں بہادروں کو ایڈرس دیا جائے۔ کوئی اپنے گھر سے روٹیاں لایا، کوئی گڑ، کوئی چوکر، کوئی بھوسی۔

ایک لڑکے نے کہا «ایسے بیل اور کسی کے پاس نہ ہوں گے۔»

دوسرے نے تائید کی «اتنی دور سے دونوں اکیلے چلے آئے۔»

تیسرا بولا «پچھلے جنم میں ضرور آدمی رہے ہوں گے۔» اس کی تردید کرنے کی کسی میں جرأت نہ تھی سب نے کہا «ہاں بھائی ضرور رہے ہوں گے»۔

جھوری کی بیوی نے بیلوں کو دروازے پر دیکھا تو جل اٹھی اور بولی «کیسے نمک حرام بیل ہیں! ایک دن بھی وہاں کام نہ کیا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔»

جھوری اپنے بیلوں پر یہ الزام برداشت نہ کرسکا۔ بولا «نمک حرام کیوں ہیں چارا دانا نہ دیا ہوگا۔ کیا کرتے؟» عورت نے تنگ آکر کہا «بس تم ہی بیلوں کو کھلانا جانتے ہو اور تو سب پانی پلا پلا کر رکھتے ہیں»۔

جھوری نے منہ چڑایا «چارا ملتا تو کیوں بھاگتے۔»

عورت چڑی «بھاگے اس لئے کہ وہ لوگ تم جیسے بدھوؤں کی طرح بیلوں کو سہلاتے نہیں۔ کھلاتے ہیں تو توڑ توڑ کر جوتتے بھی ہیں۔ یہ دونوں ٹھہرے کام چور۔ بھاگ نکلے۔ اب دیکھتی ہوں کہاں سے کھلی اور چوکر آتا ہے۔ خشک بھوسے کے سوا کچھ بھی نہ دوں گی۔ کھائیں چاہے مریں۔

وہی ہوا۔ مزدور کو تاکید کردی گئی کہ بیلوں کو صرف خشک بھوسا دیا جائے۔ بیلوں نے ناند میں منھ ڈالا تو پھیکا پھیکا۔ نہ چکناہٹ نہ رس۔ کیا کھائیں! پُر امید نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

جھوری نے مزدور سے کہا «تھوڑی سی کھلی کیوں نہیں ڈال دیتا ہے»

مزدور۔ «مالکن مجھے ضرور مار ڈالے گی۔»

جھوری۔ «ڈال دے تھوڑی سی۔»

مزدور «نہ دادا۔ بعد میں تم بھی انہیں کی سی کہو گے۔»

۲

دوسرے دن جھوری کا سالا پھر آیا اور بیلوں کو لے چلا۔ اب کے اس نے دونوں کو گاڑی میں جوتا۔ دو مرتبہ موتی نے گاڑی کو کھائی میں گرانا چاہا، مگر ہیرا نے سنبھال لیا۔ اس وقت دونوں میں قوت برداشت زیادہ تھی۔

شام کے وقت گھر پہنچ کر گیا نے دونوں کو موٹی رسیوں سے باندھا اور کل کی شرارت کا مزا چکھایا۔ پھر

وھی خشك بھوسا ڈال دیا۔ اپنے بیلوں کو کھلی چونی سب کچھ کھلایا۔

ھیرا اور موتی اس برتاؤ کے عادی نہ تھے۔ جھوری انہیں پھول کی چھڑی سے بھی نہ مارتا تھا۔ اس کی آواز پر دونوں اڑنے لگتے تھے۔ یہاں مار پڑی، اس پر خشك بھوسا۔ ناند کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھائی۔

دوسرے دن گیا نے بیلوں کو ھل میں جوتا۔ پر ان دونوں نے جیسے پاؤں اٹھانے کی قسم کھالی تھی۔ وہ مارتے مارتے تھك گیا۔ مگر انہوں نے قدم نہ اٹھایا۔ ایك مرتبہ جب اس ظالم نے ھیرا کی ناك پر ڈنڈا جمایا تو موتی غصہ کے مارے آپے سے باھر ھوگیا۔ ھل لے بھاگا۔ ھل، رسی اور جوا جوت سب ٹوٹ کر برابر ھوگئے۔ گلے میں بڑی بڑی رسیاں نہ ھوتیں تو دونوں نکل گئے تھے۔

ھیرا نے زبان خاموشی سے کہا «بھاگنا مشکل ھے۔»

موتی نے بھی نگاھوں سے جواب دیا «تمھاری تو اس نے جان لے لی تھی۔ اب کے بڑی مار پڑے گی»

ھیرا «پڑنے دو۔ بیل کا جنم لیا ھے تو مار سے کہاں بچیں گے۔»

گیا دو آدمیوں کے ساتھ دوڑا آرھا ھے۔ دونوں کے ھاتھوں مین لاٹھیاں ھیں۔

موتی «کہو تو میں بھی دکھادوں کچھ مزا۔»

ھیرا «نہیں بھائی، کھڑے ھوجاؤ۔»

موتی «مجھے مارے گا تو میں ایک آدھ کو گرادونگا۔»

ھیرا «یہ ھمارا دھرم نہیں ھے۔»

موتی دل میں اینٹھ کر رہ گیا۔ اتنے میں گیا آپہنچا۔ اور دونوں کو پکڑکر لے چلا۔

خیریت ہوئی کہ اس نے اس وقت مار پیٹ نہ کی، نہیں تو موتی بھی تیار تھا اس کے تیور دیکھہ کر سہم گیا اور اس کے ساتھی سمجھ گئے کہ اسوقت ٹال جانا ھی مصلحت ھے۔

آج دونوں کے سامنے پھر وھی خشک بھوسا لایا گیا دونوں چپ چاپ کھڑے رھے۔ گھر کے لوگ کھانا کھانے لگے اسی وقت ایک چھوٹی سی لڑکی دو روٹیاں لئے نکلی اور دونوں کے منہہ میں دے کر چلی گئی اس ایک ایک روٹی سے ان کی بھوک تو کیا مٹتی مگر دونوں کے دل کو کھانا مل گیا معلوم ھوا یہاں بھی کوئی صاحب دل رھتا ھے یہ لڑکی گیا کی تھی اس کی ماں مرچکی تھی سوتیلی ماں اسے مارتی رھتی تھی اس لئے ان بیلوں سے اسے ھمدردی تھی۔

دونوں دن بھر جوتے، جاتے اڑتے، ڈنڈے کھاتے، شام کو تھان پر باندھ دئے جاتے اور رات کو وھی لڑکی انہیں ایک ایک روٹی دے جاتی۔ محبت کے اس کھانے کی یہ برکت تھی کہ دو چار خشک بھوسے کے لقمے کھاکر بھی دونوں کمزور نہ ھوتے تھے۔ مگر دونوں کی آنکھوں کی نس نس مین سرکشی بھری تھی۔ ایک دن چپ کی زبان میں موتی نے کہا «اب تو نہیں سہا جاتا ھیرا۔»

هیرا۔ «کیا کرنا چاهئے؟»

موتی۔ «کیا کو سینگ پر اٹھا کر پھینک دوں؟»

هیرا۔ «مگر وہ لڑکی اسی کی بیٹی ہے۔ اسے مار کر گرادوگے تو وہ یتیم ہو جائے گی۔»

موتی۔ «تو مالکن کو پھینک دوں؟ وہ لڑکی کو ہر روز مارتی ہے۔»

هیرا۔ «عورت کو ماروگے؟ بڑے بہادر ہو!»

موتی۔ «تم کسی طرح نکلنے ہی نہیں دیتے۔ تو آؤ آج رسا تڑا کر بھاگ چلیں۔»

هیرا۔ «ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن ایسی موٹی رسی ٹوٹے گی کیونکر؟»

موتی۔ «پہلے رسی کو چبالو۔ پھر جھٹکا دے کر تڑا لو»

رات کو جب لڑکی روٹیاں دے کر چلی گئی، دونوں رسیاں چبانے لگے۔ پر موٹی رسی منہ میں نہ آتی تھی۔ بیچارے بار بار زور لگاکر رہ جاتے۔

معاً گھر کا دروازا کھلا اور وہی لڑکی نکلی۔ دونوں سر جھکا کر اس کے ہاتھ چاٹنے لگے۔ دونوں کی دمیں کھڑی ہو گئیں۔ اس نے ان کی پیشانی سہلائی اور بولی۔

«کھول دیتی ہوں۔ بھاگ جاؤ۔ نہیں تو یہ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے۔ آج گھر میں مشہور ہو رہا ہے کہ تمہاری ناک میں ناتھ ڈال دی جائے۔»

اس نے دونوں کے رسے کھول دیئے۔ پر دونوں

چپ چاپ کھڑے رہے۔

موتی نے اپنی زبان میں پوچھا، اب چلتے کیوں نہیں؟

هیرا نے جواب دیا ”اس غریب پر آفت آجائے گی۔ سب اسی پر شبہه کریں گے۔“

یکایک لڑکی چلائی۔ ”او دادا! او دادا! پھوپھا والے دونوں بیل بھاگے جارهے هیں۔ دوڑو! دونوں بیل بھاگے جارهے هیں۔“

گیا گھبرا کے باهر نکلا اور بیلوں کو پکڑنے چلا۔ بیل بھاگے۔ گیا نے پیچھا کیا۔ وہ اور بھی تیز ہوگئے۔ گیا نے شور مچایا۔ پھر گاؤں کے کچھ اور آدمیوں کو ساتھ لانے کیلئے لوٹا۔ بیلوں کو بھاگنے کا موقع مل گیا۔ سیدھے دوڑتے چلے گئے۔ یہاں تک که راسته کا خیال نه رہا۔ جس راه سے یہاں آئے تھے اس کا پتا نه تھا۔ نئے نئے گاؤں ملنے لگے۔ تب دونوں ایک کھیت کے کنارے کھڑے هوکر سوچنے لگے که اب کیا کرنا چاهئے؟

هیرا نے اپنی زبان میں کہا، ”معلوم هوتا هے راستا بھول گئے۔“

موتی۔ ”تم بھی بےتحاشا بھاگے۔ وهیں اسے مار گراتے“

هیرا۔ ”اسے مار گراتے تو دنیا کیا کہتی۔ وہ اپنا دھرم چھوڑ دے لیکن هم اپنا دھرم کیونکر چھوڑیں۔“

دونوں بھوک سے بے حال هو رهے تھے۔ کھیت میں مٹر کھڑی تھی۔ چرنے لگے۔ رہ رہ کر آهٹ لے رهے تھے که کوئی آتو نہیں رها هے۔ جب پیٹ بھر گیا اور دونوں کو

آزادی کا احساس ھوا تو اچھلنے کودنے لگے۔ پہلے ڈکار لی۔ پھر سینگ ملائے اور ایک دوسرے کو ڈھکیلنے لگے۔ موتی نے هیرا کو کئی قدم پیچھے ہٹا دیا یہاں تک کہ وہ ایک کھائی میں گر گیا۔ تب اسے بھی غصہ آیا سنبھل کر اٹھا اور پھر موتی سے لڑنے لگا۔ موتی نے دیکھا کہ کھیل میں جھگڑا ہوا چاھتا ھے تو ایک طرف ھٹ گیا۔

۳

ارے یہ کیا! کوئی سانڈ ڈونکتا چلا آتا ھے! ھاں سانڈ ھی تو ھے وہ سامنے آپہنچا۔ دونوں دوست تذبذب میں پڑ گئے۔

سانڈ بھی پورا ھاتھی۔ اس سے لڑنا جان سے ھاتھ دھونا تھا لیکن نہ لڑنے سے بھی جان بچتی نظر نہ آتی تھی انہیں کی طرف آرھا تھا۔ کتنا جسیم تھا!

موتی نے کہا «برے پھنسے۔ جان کیسے بچے گی؟ کوئی طریقہ سوچو۔»

ھیرا نے کہا «غرور سے اندھا ھو رھا ھے۔ منت سماجت کبھی نہ سنے گا۔»

موتی «بھاگ کیوں نہ چلیں؟»

ھیرا «بھاگنا پست ھمتی ھے۔»

موتی «تو تم یہیں مرو۔ بندہ نودو گیارہ ھوتا ھے۔»

ھیرا «اور جو دوڑائے، تو پھر؟»

موتی «کوئی طریقہ بتاؤ۔ لیکن ذرا جلدی۔ وہ تو آ پہنچا۔»

ھیرا۔ «وطریقہ یہی ھے کہ ھم دونوں ایک ساتھ حملہ کردیں۔ میں آگے سے دھکیلوں تم پیچھے سے دھکیلو۔ دیکھتے دیکھتے بھاگ کھڑا ھوگا۔ جونہی مجھ پر حملہ کرے۔ تم پیٹ میں سینگ چبھو دینا۔ جان جوکھوں کا کام ھے لیکن دوسرا کوئی طریقہ نہیں۔»

دونوں دوست جان ھتیلیوں پر لے کر آگے بڑھے۔ سانڈ کو کبھی منظم دشمن سے لڑنے کا اتفاق نہ ھوا تھا۔ وہ انفرادی جنگ کا عادی تھا۔ جونہی ھیرا پر جھپٹا موتی نے پیچھے سے ھلہ بول دیا۔ سانڈ اس کی طرف مڑا تو ھیرا نے دھکیلنا شروع کیا۔ سانڈ چاھتا تھا، ایک ایک کرکے دونوں کو گرالے۔ یہ بھی استاد تھے اسے یہ موقع ھی نہ دیتے تھے ایک مرتبہ سانڈ جھلا کر ھیرا کو ھلاک کرنے چلا۔ تو موتی نے بغل سے آکر اس کے پیٹ میں سینگ رکھ دئیے بےچارہ زخمی ھوکر بھاگا۔ اور دونوں فتحیاب دوستوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا۔ یہاں تک کہ سانڈ بے دم ھوکر گر پڑا۔ تب دونوں نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا۔

دونوں بیل فتح کے نشے میں جھومتے چلے جاتے تھے موتی نے اپنے اشاروں کی زبان میں کہا «میرا تو جی چاھتا تھا کہ بچہ جی کو مار ھی ڈالوں»۔

ھیرا «گرے ہوئے دشمن پر سینگ چلانا نامناسب ھے

موتی۔ «یہ سب فضول ہے۔ اگر اس کا داؤ چلتا تو کبھی نہ چھوڑتا۔»

ھیرا۔ «اب کیسے گھر پہنچیں گے؟ یہ سوچو۔»

موتی۔ «پہلے کچھ کھالیں تو سوچیں۔ ابھی تو عقل کام نہیں کرتی۔»

یہ کہہ کر موتی مٹر کے کھیت مین گھس گیا۔ ھیرا منع کرتا رہ گیا لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ ابھی دو ھی چار منہ مارے تھے کہ دو آدمی لاٹھیاں لئے آگئے اور دونوں بیلوں کو گھیر لیا۔ ھیرا تو مینڈ پر تھا، نکل گیا۔ موتی کھیت میں تھا اس کے کُھر کیچڑ میں دھنسنے لگے۔ نہ بھاگ سکا۔ پکڑا گیا۔ ھیرا نے دیکھا، دوست تکلیف میں ھے تو لوٹ پڑا۔ پھنسیں گے تو اکٹھے۔ رکھوالوں نے اسے بھی پکڑ لیا۔ دوسرے دن دونوں دوست کانجی ھاؤس میں تھے۔

۴

ان کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ سارا دن گذر گیا اور کھانے کو تنکا بھی نہ ملا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا، یہ کیسا مالک ھے۔ اس سے تو گیا ھی اچھا تھا۔ وھاں کئی بھینسیں تھیں، کئی بکریاں تھیں، کئی گھوڑے، کئی گدھے۔ مگر چارا کسی کے سامنے بھی نہ تھا۔ سب زمین پر مردے کی طرح پڑے تھے۔ کئی تو اس قدر لاغر ھوگئے تھے کہ کھڑے بھی نہ ھوسکتے تھے۔ سارا دن دروازہ کی طرف

دیکھتے رہے۔ مگر کوئی چارہ لے کر نہ آیا۔ تب غریبوں نے دیوار کی نمکین مٹی چاٹنی شروع کی۔ مگر اس سے کیا تسکین ہو سکتی تھی؟

جب رات بھی کھانا نہ ملا تو ہیرا کے دل میں سرکشی کے خیالات پیدا ہوئے۔ موتی سے بولا «مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جان نکل رہی ہے۔»

موتی۔ «اتنی جلدی ہمت نہ ہارو بھائی۔ یہاں سے بھاگنے کا طریقہ سوچو۔»

ہیرا۔ «آؤ دیوار توڑ ڈالیں۔»

موتی۔ «مجھ سے تو اب کچھ نہ ہوگا۔»

ہیرا۔ «بس۔ اسی بوتے پر اکڑتے تھے۔»

موتی۔ ”ساری اکڑ نکل گئی بھائی“

باڑے کی دیوار کچی تھی۔ ہیرا نے اپنے نکیلے سینگ دیواروں میں گاڑ دئیے اور زور مارا تو مٹی کا ایک چپڑ نکل آیا۔ اس سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے دوڑ دوڑ کر دیوار سے ٹکریں ماریں۔ ہر ٹکر میں تھوڑی تھوڑی مٹی گرنے لگی۔

اتنے میں کانجی ہاؤس کا چوکیدار لالٹین لے کر جانوروں کی حاضری لینے آنکلا۔ ہیرا کی وحشت دیکھ کر اس نے اسے کئی ڈنڈے رسید کئے اور موٹی سی رسی سے باندھ دیا۔

موتی نے پڑے پڑے اس کی طرف دیکھا۔ گویا زبان حال سے کہا۔ ”آخر مار کھائی کیا ملا؟“

ھیرا۔ ”زور تو آزما لیا۔“

موتی۔ ”ایسا زور آزمانا کس کام کا۔ اور بندھن میں پڑ گئے۔“

ھیرا۔ ”اس سے باز نہ آؤنگا۔“

موتی۔ ”جان سے ھاتھ دھو بیٹھو گے۔“

ھیرا ”اس کی مجھے پروا نہیں۔ یوں بھی مرنا ھے۔ ذرا سوچو، اگر دیوار گر جاتی، تو کتنی جانیں بچ جاتیں اتنے بھائی یہاں بند ھیں۔ کسی کے جسم مین جان ھی نہیں۔ دو چار دن یہی حال رھا تو سب مرجائیں گے۔“

موتی نے بھی اسی جگہ سینگ مارا۔ تھوڑی سی مٹی گری۔ اور ھمت بڑھی۔ تو وہ دیوار میں سینگ لگا کر اسی طرح زور کرنے لگا۔ جیسے کسی سے لڑ رھا ھو آخر کوئی دو گھنٹہ کی زور آزمائی کے بعد دیوار کا کچھ حصہ گر گیا۔ اس نے دوگنی طاقت سے دوسرا دھکا لگایا تو آدھی دیوار گر پڑی۔

دیوار کا گرنا تھا کہ نیم جان جانور اُٹھ کھڑے ھوئے۔ تینوں گھوڑیاں بھاگ نکلیں۔ بھیڑ بکریاں نکلیں۔ اس کے بعد بھینسیں بھی کھسک گئیں۔ پر گدھے ابھی کھڑے تھے۔

ھیرا نے پوچھا۔ ”تم کیوں نہیں جاتے؟“۔

ایک گدھے نے کہا ”کہیں پھر پکڑ لئے جائیں تو۔“

ھیرا ”پکڑ لئے جاؤ۔ پھر دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو موقع ھے“۔

گدھا۔ وہمیں ڈر لگتا ھے ہم نہ بھاگیں گے۔"

آدھی رات گذر چکی تھی۔ دونوں گدھے کھڑے سوچ رھے تھے بھاگیں یا نہ بھاگیں؟ موتی اپنے دوست کی رسی کاٹنے میں مصروف تھا۔ جب وہ ھار گیا تو ھیرا نے کہا "تم جاؤ مجھے یہیں رھنے دو۔ شاید کبھی ملاقات ھوجائے"

موتی نے آنکھوں میں آنسو لاکر کہا "تم مجھے خود غرض سمجھتے ھو ھیرا! ہم اور تم اتنے دنوں ساتھ رھے۔ آج تم مصیبت میں پھنسے تو میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں!"

ھیرا۔ "بہت مار پڑیگی۔ سمجھ جائیں گے یہ تمھاری شرارت ھے۔"

موتی "جس قصور کے لئے تمھارے گلے میں رسا پڑا ھے اس کے لئے اگر مجھ پر مار پڑے گی تو کیا بات ھے اتنا تو ھو گیا کہ نو دس جانوروں کی جان بچ گئی۔"

یہ کہہ کر موتی نے دونوں گدھوں کو سینگ مار مار کر باھر نکال دیا اور اپنے دوست کے پاس آ کر سو گیا۔

صبح ھوتے ھوتے منشیوں، چوکیداروں اور دوسرے ملازموں میں کھلبلی مچ گئی۔ اس کے بعد موتی کی مرمت ھوئی! اور اسے بھی موٹی رسی سے باندھ دیا گیا۔

۵

ایک ھفتہ تک دونوں بیل بندھے پڑے رھے۔ خدا جانے اس کانجی ھاؤس کے آدمی کیسے بے درد تھے کہ کسی

نے چارے کا ایک تنکا تک نہ ڈالا - ہاں ایک مرتبہ پانی دکھایا جاتا تھا یہی ان کی خوراک تھی - دونوں اتنے کمزور ہوگئے کہ اٹھا تک نہ جاتا تھا - ہڈیاں تک نکل آئیں -

ایک دن باڑے کے سامنے ڈگڈگی بجنے لگی - اور دوپہر ہوتے ہوتے پچاس ساٹھ آدمی جمع ہوگئے - تب دونوں بیل نکالے گئے اور ان کی دیکھ بھال ہونے لگی - لوگ آ آکر ان کی صورت دیکھتے اور چلے جاتے تھے - ایسے نیم جان بیلوں کو کون خریدتا !

معاً ایک آدمی جس کی آنکھیں سرخ تھیں اور جس کے چہرے پر سخت دلی کے آثار نمایاں تھے آیا اور منشی جی سے باتیں کرنے لگا. اس کی شکل دیکھ کر کسی نامعلوم احساس سے دونوں بیل کانپ اٹھے - وہ کون ہے اور انہیں کیوں خریدتا ہے - اس کے متعلق انہیں کوئی شبہ نہ رہا - دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھکالیا -

ہیرا نے کہا ”گیا کے گھر سے ناحق بھاگے - اب جان نہ بچے گی -“

موتی نے جواب دیا ”کہتے ہیں بھگوان سب پر مہربانی کرتے ہیں - انہیں ہماری حالت پر رحم کیوں نہیں آتا؟“

ہیرا - ”بھگوان کے لئے ہمارا مرنا جینا دونوں برابر ہیں -“

موتی - ”چلو اچھا ہے - کچھ دن ان کے پاس رہیں گے -“

ہیرا - ”ایک مرتبہ بھگوان نے اس لڑکی کے روپ

میں بچایا تھا۔ کیا اب نہ بچائیں گے؟»

موتی۔ ”یہ آدمی چھری چلائے گا۔ دیکھ لینا۔“

هیرا۔ ”معمولی بات هے مرکر ان دکھوں سے چھوٹ جائیں گے۔“

نیلام هوجانے کے بعد دونوں بیل اس آدمی کے ساتھ چلے۔ دونوں کی بوٹی بوٹی کانپ رهی تھی۔ بچارے پاؤں تک نه اٹھا سکتے تھے۔ مگر ڈر کے مارے چلے جاتے تھے۔ ذرا بھی آهسته چلتے، تو وه ڈنڈا جما دیتا تھا۔

راه میں گائے بیل کا ایک ریوڑ مرغزار میں چرتا نظر آیا۔ سبھی جانور خوش تھے کوئی اچھلتا تھا۔ کوئی بیٹھا جگالی کرتا تھا۔ کیسی پرمسرت زندگی تھی۔ لیکن وه کیسے خودغرض تھے۔ کسی کو ان کی پرواه نه تھی۔ کسی کو خیال نه تھا، که ان کے دو بھائی موت کے پنجه میں گرفتار هیں۔

معاً انهیں ایسا معلوم هوا، که یه رسته دیکھا هوا هے هاں ادھر هی سے تو گیا ان کو اپنے گاؤں لے گیا تھا۔ وهی کھیت هیں۔ وهی باغ؛ وهی گاؤں۔ اب ان کی رفتار تیز هونے لگی۔ ساری تکان، ساری کمزوری، ساری مایوسی رفع هوگئی ارے، یه تو اپنا کھیت آگیا۔ یه اپنا کنواں هے۔ جهاں هر روز پانی پیا کرتے تھے۔

موتی نے کها۔ «همارا گھر نزدیک آگیا هے۔»

هیرا بولا۔ «بھگوان کی مهربانی هے۔»

موتی۔ «مین تو اب گھر کو بھاگتا هوں۔»

هیرا۔ «یہ جانے بھی دے گا۔ اتنا سوچ لو۔»

موتی۔ «اسے مار گراتا ہوں۔ جب تک سنبھلے، تب تک ہم گھر جا پہنچیں گے۔»

ہیرا۔ «نہیں، دوڑ کر تھان تک چلو۔ وہاں سے آگے نہ چلیں گے۔»

دونوں مست ہو کر بچھڑوں کی طرح کلیلیں کرتے ہوئے گھر کی طرف دوڑے۔ اور تھان پر جا کر کھڑے ہو گئے وہ آدمی بھی پیچھے پیچھے دوڑا آتا تھا۔

جھوری دروازہ پر بیٹھا دھوپ کھا رہا تھا۔ بیلوں کو دیکھتے ہی دوڑا۔ اور انہیں پیار کرنے لگا۔ بیلوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک جھوری کا ہاتھ چاٹ رہا تھا۔ دوسرا پیر۔

اس آدمی نے آکر بیلوں کی رسیاں پکڑلیں۔ جھوری نے کہا۔ «یہ بیل میرے ہیں۔»

«تمہارے کیسے ہیں۔ میں نے نیلام میں لئے ہیں۔»

جھوری۔ «میرا خیال ہے چرا کر لائے ہو۔ چپکے سے چلے جاؤ۔ بیل میرے ہیں میں بیچوں گا، تو بکیں گے، کسی کو میرے بیل بیچنے کا کیا حق ہے؟»

«میں نے تو خریدے ہیں۔»

«خریدے ہوں گے۔»

اس پر وہ آدمی زبردستی بیلوں کو لے جانے کے لئے آگے بڑھا۔ اسی وقت موتی نے سینگ چلایا۔ وہ آدمی پیچھے

ھٹا۔ موتی نے تعاقب کیا۔ اور اسے ریلتا ہوا گاؤں کے باہر تک لے گیا۔ اور تب اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آدمی دور کھڑا دھمکیں دیتا تھا۔ گالیاں دیتا تھا۔ پتھر پھینکتا تھا۔ اور موتی اس کا راستہ روکے ہوئے تھا۔ گاؤں کے لوگ یہ تماشا دیکھتے تھے اور ھنستے تھے۔

جب وہ آدمی ھار کر چلا گیا۔ تو موتی اکڑتا ہوا لوٹ آیا۔

ھیرا نے کہا۔ «میں ڈر رہا تھا، کہیں تم اسے مار نہ بیٹھو۔»

موتی۔ «اگر نزدیک آتا تو ضرور مارتا۔»

ھیرا۔ «اب نہ آئے گا۔»

موتی۔ «آئے گا تو دور ھی سے خبر لوں گا۔ دیکھوں کیسے لے جاتا ھے۔»

ذرا دیر بعد ناند میں کھلی، بھوسہ۔ چوکر، دانہ سب کچھ بھر دیا گیا۔ دونوں بیل کھانے لگے۔ جھوری کھڑا ان کی طرف دیکھتا اور خوش ہوتا تھا۔ بیسیوں لڑکے تماشا دیکھ رھے تھے۔ سارا گاؤں مسکراتا معلوم ہوتا تھا۔

اسی وقت مالکن نے آکر اپنے دونوں بیلوں کے ماتھے چوم لئے۔

ابوالکلام آزاد

ایک خط

قلعۂ احمد نگر

۷- جنوری ۴۳ء

صدیق مکرم- وہی صبح چار بجے کا جان افزا وقت ہے سردی اپنے پورے عروج پر ہے- کمرہ کا دروازہ اور کھڑکی کھلی چھوڑ دی ہے- ہوا کے برفانی جھونکے دمبدم آ رہے ہیں- چائے دم دے کے ابھی ابھی رکھی ہے- منتظر بیٹھا ہوں کہ پانچ منٹ گزر جائیں اور رنگ و کیف اپنے معیاری درجہ پر آجائے تو دور شروع کروں- دو مرتبہ نگاہ گھڑی کی طرف اٹھ چکی ہے- مگر پانچ منٹ ہیں کہ کسی طرح ہونے پر نہیں آتے-

اس علاقہ میں عام طور پر سردی بہت ہلکی ہوتی ہے- معلوم نہیں کبھی اس طرف بھی آپ کا گذر ہوا ہے یا نہیں اور اگر ہوا ہے تو کس موسم میں؟ لیکن پونا تو آپ بارہا گئے ہوں گے- ڈسمبر ۱۹۱۰ء کا سفر مجھے بھی یاد ہے- جب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے موقع پر آپ سے وہاں ملاقات ہوئی تھی- پونا یہاں سے صرف اسی میل کی مسافت پر واقع ہے اور دکن کا یہ تمام حصہ

ایک ھی سطح مرتفع ھے۔ اس لئے یہاں کی موسمی حالت کو پونا پر قیاس کر لیجئے۔ علاوہ بریں وقت کے زندانی کچھ پونا میں رکھے گئے ھیں، کچھ یہاں اس لئے ویسے بھی اہل قیاس کے نزدیک بقول عرفی دونوں کا حکم ایک ھی ھوا.

یکیست نسبت شیرازی و بدخشانی

فیضی کو جب اکبر نے سفارت پر یہاں بھیجا تھا تو معاملات کی پیچیدگیوں نے اسے دو سال تک ھلنے نہیں دیا اور یہاں کے ھر موسم کے تجربے کا موقع ملا۔ اس نے اپنے مکاتیب میں احمد نگر کی آب و ھوا کے اعتدال کی بہت تعریف کی تھی۔ فیضی سے بہت پہلے کا یہ واقعہ ھے کہ ملک التجار شیرازی نے مولانا جامی کو دکن آنے کی دعوت دی تھی اور لکھا تھا کہ اس ملک میں بارہ مہینے ھوائے معتدل کا لطف اٹھایا جاسکتا ھے۔ خیر بارہ مہینا کہنا تو صریح مبالغہ تھا، مگر اس میں شک نہیں کہ یہاں گرمی کے دن بہت کم ھوتے ھیں اور یہاں کی برسات مالوہ کی برسات کی طرح پرلطف ھوتی ھے۔ غالباً ۱۹۰۵ع کی بات ھے کہ بمبئی میں مرزا فرصت شیرازی صاحب آثارالعجم سے ملنے کا اتفاق ھوا تھا۔ وہ برسات کا موسم پونا میں بسر کرکے لوٹے تھے اور کہتے تھے، پونا کی ھوا کے اعتدال نے ھوائے شیراز کی یاد تازہ کردی۔

اے گل بتو خرسندم، تو بوئے کسے داری!

میرا ذاتی تجربہ معاملہ کو یہاں تک نہیں لے جاتا۔ لیکن

بہر حال میں شیراز میں مسافر تھا، اور مرزا ئے موصوف صاحب البیت تھے۔

اورنگ زیب جب دکن آیا تھا تو برشگال کا اعتدال اس کی طبع خشک کو بھی تر کئے بغیر نہ رہا تھا۔ آپ نے تاریخ خوافی خان اور مآثر الامرأ وغیرہ میں جابجا پڑھا ہوگا کہ برسات کا موسم اکثر احمد نگر یا پونا میں بسر کرتا تھا۔ پونا کا نام تو اس نے «محی نگر» رکھا تھا مگر زبانوں پر نہیں چڑھا۔ اس کا انتقال احمدنگر ھی میں ہوا تھا۔

جہاں تک اس اعتدال کا تعلق گرمی اور برسات کے موسم سے ھے، اس کے حسن و خوبی میں کلام نہیں۔ مگر مصیبت یہ ھے کہ یہاں کا سردی کا موسم بھی معتدل ہوتا ھے۔ حالانکہ سردی کا موسم ایک ایسا موسم ھے کہ اس میں جس قدر بھی زیادتی ہو موسم کا حسن اور زندگی کا عیش ھے۔ اس کی کمی نقص و فتور کا حکم رکھتی ھے۔ اسے اعتدال کہہ کر سراہا نہیں جاسکتا۔

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اوائل عمر سے میری طبیعت کا اس بارے میں کچھ عجیب حال رہا ھے۔ گرمی کتنی ھی معتدل ہو مگر مجھے بہت جلد پریشان کر دیتی ھے اور ھمیشہ سرد موسم کا خواستگار رہتا ہوں۔ موسم کی خنکی میرے لئے زندگی کا اصلی سرمایہ ھے۔ یہ پونجی ختم ہوئی اور گویا زندگی کی ساری کیفیتیں ختم ہوگئیں۔ چونکہ زندگی بہر حال بسر کرنی ھے، اس لئے کوشش کرتا رہتا

هوں که هر موسم سے ساز گار رهوں لیکن طبیعت کے اصلی تقاضوں پر غالب نهیں آسکتا۔ افسوس یه هے که هندوستان کا موسم سرما اس درجه تنک مایه هے که ابهی آیا نهیں که جانا شروع کر دیتا هے، اور دیکھتے هی دیکھتے ختم هوجاتا هے۔ میری طبع سراسیمه کے لئے اس صورت حال میں صبر و شکیب کی ایک عجیب آزمائش پیدا هوگئی هے۔ جب تک وه آتا نهیں، اس کے انتظار میں دن کاٹتا هوں جب آتا هے تو آمد کی خوشیوں میں محو هو جاتا هوں، لیکن اس کا قیام اتنا مختصر هوتا هے که ابهی اس کی پذیرائیوں کے سرو برگ سے فارغ نهیں هوا که اچانک هجراں و وداع کا ماتم سر پر آکهڑا هوتا هے۔ میں آپ کو بتلاؤں میرے تخیل میں عیش زندگی کا سب سے بهتر تصور کیا جاسکتا هے؟ جاڑے کا موسم هو اور جاڑا بهی قریب قریب درجۂ انجماد کا۔ رات کا وقت هو۔ آتشدان میں اونچے اونچے شعلے بهڑک رهے هوں اور میں کمرے کی ساری مسندیں چهوڑ اس کے قریب بیٹها هوں اور پڑهنے میں مشغول هوں۔ معلوم نهیں بهشت کے موسم کا کیا حال هوگا؟ وهاں کی نهروں کا ذکر بهت سننے میں آیا هے۔ ڈرتا هوں که کهیں گرمی کا موسم نه رهتا هو۔

سنتے هیں جو بهشت کی تعریف، سب درست
لیکن خدا کرے وه تری جلوه گاه هو!

عجیب معامله هے۔ میں نے بارها غور کیا که میرے

تصور میں آتشدان کی موجودگی کو اتنی اہمیت کیوں مل گئی ہے؟ لیکن کچھ بتلا نہیں سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ سردی اور آتشدان کا رشتہ چولی دامن کا رشتہ ہوا۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کرسکتے۔ میں سردی کے موسم کا نقشہ اپنے ذہن میں کھینچ ہی نہیں سکتا اگر آتشدان نہ سلگ رہا ہو۔ پھر آتشدان بھی وہی پرانی روش کا ہونا چاہئے جس میں لکڑیوں کے بڑے بڑے کندے جلائے جاسکیں۔ بجلی کے ہیٹر سے میری تسکین نہیں ہوتی بلکہ اسے دیکھ کر طبیعت چڑ سی جاتی ہے۔ ہاں گیس کے آتشدان کی ترکیب اتنی بے معنی محسوس نہیں ہوتی کیونکہ پتھر کے ٹکڑے رکھ کر انگاروں کے ڈھیر کی شکل بنا دیتے ہیں اور اس کے نیچے سے شعلے نکلتے رہتے ہیں کم از کم شعلوں کی نوعیت باقی رہتی ہے۔ پھر بھی میں اسے ترجیح دینے کے لئے تیار نہیں۔ در اصل میں صرف گرمی ہی کے لئے آتشدان کا شیدائی نہیں ہوں، مجھے شعلوں کا منظر چاہئے۔ جب تک شعلے بھڑکتے نظر نہ آئیں، دل کی پیاس بجھتی نہیں۔ بے دردوں کو جو دل کی جگہ برف کی سل سینہ میں چھپائے پھرتے ہیں، ان معاملات کی کیا خبر؟ آپ سن کر ہنسیں گے۔ بارہا ایسا ہوا کہ اس خیال سے کہ سردی کا زیادہ سے زیادہ احساس پیدا کروں جنوری کی راتوں میں آسمان کے نیچے بیٹھ کر صبح کی چائے پیتا رہا اور اپنے آپ کو اس دھوکے میں ڈالتا رہا کہ آج سردی خوب پڑ رہی ہے۔

میری طبیعت کا بھی عجیب حال ہے۔ دوسروں سے پہلے خود اپنی حالت پر ہنستا ہوں۔ بچپنے میں چند مہینے چنسورہ میں بسر کئے تھے۔ کیونکہ کلکتہ میں طاعون پھیل رہا تھا۔ یہ جگہ عین دریائے ہگلی پر واقع ہے۔ میں نے یہیں سب سے پہلے تیرنا سیکھا۔ صبح و شام گھنٹوں دریا میں تیرتا رہتا۔ پھر بھی جی سیر نہ ہوتا۔ اب بھی تیراکی کے لئے طبیعت ہمیشہ ترستی رہتی ہے۔ سبحان اللہ! طبع بوقلموں کی نیرنگ آرائیاں دیکھئے۔ ایک طرف دریا سے ہم عنانی کا یہ ذوق و شوق، دوسری طرف آگ کے شعلوں سے سیراب ہونے کی یہ تشنگی! شاید یہ اس لئے ہو کہ اقلیم زندگی کی سطح پر پانی بہتا ہے، تہہ میں آگ بھڑکتی رہتی ہے۔

اگست کے مہینے میں جب ہم یہاں لائے گئے تو بارش کا موسم عروج پر تھا اور ہوا خوشگوار تھی۔ بالکل ایسی فضا رہتی تھی۔ جیسی آپ نے جولائی اور اگست میں پونا کی دیکھی ہوگی۔ پانی یہاں عام طور پر بیس پچیس انچ سے زیادہ نہیں برستا، لیکن پانی کی دو چار بوندیں بھی کافی خوشگواری پیدا کر دیتی ہیں۔ اُمس بہت کم ہوتی ہے۔ ہوا برابر چلتی رہتی ہے۔

ستمبر اور اکتوبر اسی عالم میں گذرا۔ لیکن جب نومبر شروع ہوا، تو طبیعت اس خیال سے افسردہ رہنے لگی کہ یہاں سردی کا موسم بہت ہلکا ہوتا ہے۔ چھاؤنی کا کمانڈنگ آفیسر جو پچھلا جاڑا یہاں بسر کر چکا ہے۔ کہتا تھا کہ پونا

سے کچھ زیادہ سردی تھی لیکن وہ بھی بہ مشکل دس بارہ دن تک رہی ہوگی۔ عام طور پر دسمبر اور جنوری کا موسم یہاں ایسا رہتا ہے جیسا دہلی اور پنجاب میں جاڑے کے ابتدائی دنوں کا ہوتا ہے۔ ان خبروں نے طبیعت کو بالکل مایوس کردیا تھا۔ لیکن جوں ہی ڈسمبر شروع ہوا، موسم نے اچانک کروٹ بدلی۔ دو دن تک بادل چھایا رہا اور پھر جو مطلع کھلا تو کچھ نہ پوچھئے، موسم کی فیاضیوں کا کیا عالم ہوا! دہلی اور لاہور کے چلہ کا مزہ یاد آگیا۔ یہاں کے کمروں میں بھلا آتشدان کہاں؟ لیکن اگر ہوتا تو موسم ایسا ضرور ہوگیا تھا کہ میں لکڑیاں چننی شروع کردیتا چیتہ خاں جو ہر وقت خاکی تخفیفہ (یعنے شارٹ) پہنے رہتا تھا، یکایک گرم سوٹ پہن کر آنے لگا اور کہنے لگا کہ سردی سے میرے گھٹنوں میں درد ہونے لگا ہے۔ چھاؤنی سے خبر آئی کہ ایک انگریز سپاہی جو رات کے پہرے پر تھا صبح نمونیا میں مبتلا ہوگیا اور شام ہوتے ہوتے ختم ہوگیا۔ ہمارے قافلہ کے زندانوں کا یہ حال ہوا کہ دوپہر کے وقت بھی چادر جسم سے چمٹی رہنے لگی۔ جسے دیکھو سردی کی سختیوں کا شاکی ہے اور دھوپ میں بیٹھ کر تیل کی مالش کر رہا ہے کہ تمام جسم پھٹ کر چھلنی ہوگیا ہے حتی کہ جو صاحب دہلی اور یوپی کے رہنے والے ہیں اور نینی تال کے موسم کے عادی رہ چکے ہیں وہ بھی یہاں کے جاڑے کے قائل ہوگئے۔

ضلع کا کلکٹر اسی علاقہ کا باشندہ ہے۔ وہ آیا تو کہنے لگا کہ سالہا سال گزر گئے ہیں، میں نے ایسا جاڑا اس علاقہ میں نہیں دیکھا۔ پارا چالیس درجہ سے بھی نیچے اتر چکا ہے۔ یہاں سب حیران ہیں کہ اس سال کونسی نئی بات ہوگئی ہے کہ اچانک پنجاب کی سی سردی احمد نگر پہنچ گئی۔ میں نے جی میں کہا، ان بے خبروں کو کیا معلوم کہ ہم زندانیوں اور خراباتیوں کی دعائیں کیا اثر رکھتی ہیں۔

یہاں کے لوگ تو سردی کی سختیوں کی شکایت کر رہے ہیں اور میرے دل آرزومند سے اب بھی صدائے ھل من مزید اٹھ رہی ہے۔ کلکتہ سے گرم کپڑے آئے ہیں۔ میں نے ابھی تک انہیں چھوا بھی نہیں۔ اس ڈر سے کہ اگر گرم کپڑے پہنوں گا تو سردی کا احساس کم ہو جائے گا۔ اور تخیل کو جولانیوں کا موقع نہیں ملے گا، ابھی تک گرمیوں کے ھی لباس میں وقت نکال رہا ہوں۔ البتہ صبح اٹھتا ہوں تو اونی چادر دھری کرکے کاندھوں پر ڈال لیتا ہوں۔

(غبار خاطر)

حسرت موہانی

حسرت ضلع اناؤ کے مردم خیز قصبہ موہان میں نیشاپوری سادات کے خاندان میں ۱۲۹۸ھ میں پیدا ہوئے۔ قران پاک اور فارسی کی ابتدائی تعلیم موہان ہی میں حاصل کی۔ اس کے بعد اردو مڈل اسکول میں داخل ہوئے اور اس امتحان میں تمام صوبے میں ممتاز رہکر سرکاری وظیفہ حاصل کیا اور مزید تعلیم کے لئے فتح پور ہسوہ جاکر گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہوئے اور انٹرنس کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کرکے وظیفہ حاصل کیا۔

فتح پور ہی میں ان کی شاعری کی زبان کھلی۔ کچھ مخصوص احباب کی صحبت سیں ادبی ذوق پیدا ہوا۔ اور عمر کے ساتھ یہ ذوق بڑھتا گیا۔ فتح پور سے انٹرنس پاس کرکے علی گڈھ میں جاکر داخل ہوئے۔ وہ ذوق و صحبت اور لطف و لطافت کے اس مرکز میں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ سنا ہے چونکہ وہ شرفائے اودھ کے لباس اور وضع میں تھے۔ اور ساتھ ہی اودھ کی پرانی وضع کا بڑا سا پاندان بھی ساتھ تھا۔ کالج کے دستور کے مطابق بے تکلف دوستوں نے ان کو خالہ جان کا خطاب دیا۔ مگر خالہ جان نے بھانجوں کی شرارت اور

چھیڑ چھاڑ کی کبھی پرواہ نہ کی اور اپنے مذاق طبیعت پر برابر جمے رہے۔ وہاں شعر وسخن کی ایک نئی مجلس اردوے معلی کے نام سے قائم کی اور ان کے وجود سے شعر وسخن کے چرچے نے کافی ترقی کرلی۔ کالج کی یونین میں بارہا تقریریں کیں اور نظمیں سنائیں اور حاضرین اور نواب محسن الملک سے داد تحسین حاصل کی۔

مرحوم نے ۱۹۰۳ع میں بی-اے کی ڈگری حاصل کی اور مذاق زمانہ کے خلاف کسی اعلا ملازمت کے بجائے علم وفن اور شعر و سخن کی خدمت کا تہیہ کیا اور اردوے معلی کے نام سے ایک بلند پایہ ادبی رسالہ علی گڈھ سے جاری کیا۔ اس سے دو تین سال پہلے مخزن لاہور سے نکل چکا تھا اردوے معلی نوجوان جدید تعلیم یافتہ گروہ کی ادبی خدمت کا دوسرا قدم تھا۔ مگر مرحوم کی طبیعت میں جو تضاد تھا اس کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ اردوے معلی کے صحن میں شعر و سخن چمنستان کے ساتھ سیاست کا خارستان بھی نظر آیا۔ چنانچہ اس زمانہ میں جب مسلمان سیاسیات سے جھجھکتے تھے علی گڈھ کا یہ نوجوان بیباک گریجوٹ کانگریس میں شامل ہوگیا اور ۱۹۰۴ع میں بمبئی کے اجلاس کانگریس میں ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شریک ھوا۔ اور سورت کانگریس تک یہ برابر شریک رہے۔ سورت کانگریس کے اختلاف کے بعد یہ تلک کی رہبری میں کانگریس سے الگ ہوگئے۔

حسرت مرحوم سے میری ملاقات قید سے چھوٹنے کے

بعد ۱۹۱۰ع میں ہوئی اور وہ اس طرح کہ میں دارالعلوم ندوہ سے فارغ ہوکر «الندوہ» کا سب اڈیٹر اور مدرسہ میں مدرس تھا۔ مدرسہ کے قریب ہی گولہ گنج میں نواب مرشدآباد کے مکان کے ایک کمرہ مین رہتا تھا۔ یہ وہی مکان ہے جس میں اب اخبار حق کا دفتر ہے۔ میں اپنی کوٹھری میں تھا کہ ایک صاحب نے آکر اطلاع دی کہ باہر ایک صاحب کھڑے ہوئے تم کو بلاتے ہیں باہر نکلا تو حسرت تھے۔ میں نے کہا کہ آپ نے تکلیف کیوں کی، اندر کیوں نہیں چلے آئے۔ اس زمانہ کی سیاسی حالت کی پستی کا اندازا کیجئے۔ حسرت نے جواب دیا کہ چونکہ لوگ مجھ سے ملتے ہوئے گھبراتے ہیں اس لئے میں نے احتیاط کی راہ سے مطلع کردیا۔ میں حسرت صاحب کو اپنے کلبۂ احزان میں لایا چھت پر جو کمرا تھا اس میں بستی اور گورکھپور کے کچھ احباب تھے جو کرسچین کالج میں پڑھتے تھے۔ آرام کے خیال سے رات کو سونے کے لئے وہاں ان کے لئے انتظام ہوا۔ ہاں یہ بتا دینا چاہئے کہ اس وقت سیاست میں سودیشی تحریک کا آغاز ہوچکا تھا۔ یہ سردی کا زمانہ تھا۔ میزبانوں نے ان کے پائتانہ کمبل رکھ دیا تھا۔ وہ کمبل ولایتی تھا۔ حسرت نے رات سردی میں اسی طرح کاٹ دی، مگر وہ کمبل نہیں اوڑھا۔

اس کے بعد جب کبھی حسرت صاحب کا لکھنؤ آنا ہوتا تو ہمارے دارالاقامہ میں آتے اور سیاست پر باتیں کرتے

اور تلک مہاراج کے سیاسی خیالات اور سیاسی عزائم کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز میں کرتے اور ہندوستان کی آزادی کی پیشین گوئی جس یقین اور عقیدہ کی پختگی کے ساتھ کرتے اس پر ہم کو بڑا تعجب ہوتا اور سیات کی ہر مشکل آسان نظر آنے لگتی۔

حسرت مسلمانوں میں سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے سودیشی تحریک کی رہبری کی۔ حسرت ہمیشہ کے غریب تھے اور یہ غربت ان معنوں میں ان کی اختیاری تھی کہ کالج کے دوسرے تعلیم یافتوں کی طرح انہوں نے سرکاری نوکری کی راہ اختیار نہیں کی۔ اور اس امارت اور تعیش کی زندگی پر افلاس اور عسرت کی زندگی کو ترجیح دی۔ انہوں نے چند آنے گز سے زیادہ کپڑا نہیں پہنا اور ولایتی کپڑے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اب انہوں نے سودیشی تحریک مین عملاً حصہ اس طرح لیا کہ سودیشی اسٹور کے نام سے سودیشی کپڑوں کی دکان قائم کی اور چاہا کہ ملک میں اس کی شاخیں جابجا قائم کی جائیں۔ ان کے اس کام میں نواب وقارالملک جو خود بھی اس سادگی پر عامل تھے اور مولانا شبلی مرحوم نے ان کی مدد کی۔ ان دونوں کی سفارش پر وہ سر فاضل بھائی کریم بھائی سے ملے اور مولانا کی سفارش سے سر فاضل بھائی سے قرض کپڑا خریدا۔ اور اسٹور قائم کر دیا۔ ان کی تجارتی سرگرمی کو دیکھ کر مولانا شبلی مرحوم نے ان سے کہا کہ تم آدمی ہو یا جن۔ پہلے شاعر

تھے پھر پالیٹیشن بنے اور اب بنئے ہوگئے۔ ان کی یہ دکان چل نکلی تھی کہ پے در پے سیاسیات کے انقلابات نے ان کو کبھی بنیا بن کر اطمینان سے بیٹھنے نہیں دیا۔ اس لئے وہ نفع سے زیادہ خسارا ھی اٹھاتے رہے۔

۱۹۱۴ع والی عالمگیر جنگ روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ ٹرکی نے اتحادیوں کے برخلاف جرمنی کا ساتھ دیا تھا جس سے مسلمانوں کی ہمدردی خواہ مخواہ جرمنی کے ساتھ پیدا ھوگئی تھی۔ تھوڑے دنوں کے بعد انگریزوں کی سازش سے شریف حسین نے امیر فیصل کی سرکردگی میں ٹرکی سے بغاوت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں شریف حسین کے خلاف بھی نفرت پیدا ھوگئی۔ حضرت مولانا محمود حسن صاحب (شیخ الہند) اور ان کے دوسرے رفقاء حجاز میں قید ھوکر مالٹا بھیجدئے گئے ہندوستان میں بڑے بڑے احرار لیڈر نظربند کر دئے گئے۔ مولانا ابوالکلام رانچی میں اور محمد علی مرحوم اور شوکت علی مرحوم چھندواڑہ میں۔ لیکن ابھی تک حسرت آزاد تھے اور مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی میں احرار کی سربراھی کر رہے تھے۔ آخر وہ ۱۹۱۶ع میں پہلے للت پور اور پھر میرٹھ میں قید کردئے گئے جس سے جنگ کے بعد چھوٹے۔ اس قید میں جو مصیبتیں حسرت نے جھیلیں اور جس طرح ناخوشگوار حالات کا مقابلہ کیا وہ اخلاق کی پختگی اور عقیدہ کی استواری کی ایک بڑی مثال ھے۔ تحریک خلافت کے آغاز میں امرت سر کے اجلاس

کانگریس دسمبر ۱۹۱۹ع سے واپسی کے بعد گاندھی جی کے مشورہ سے یہ ضروری سمجھا گیا کہ کام شروع کرنے سے پہلے مسلمان رہنماؤں کا ایک وفد وائسرائے سے دھلی میں ملاقات کر کے اپنے مطالبات پیش کرے۔ وائسرائے نے ڈیپوٹیشن سے ملنا منظور کیا۔ اس ڈیپوٹیشن میں گرم نرم ھر قسم کے لیڈر موجود تھے۔ حکیم صاحب، ڈاکٹر انصاری، محمد علی، شوکت علی وغیرہ سب ھی تھے۔ خاکسار بھی شریک تھا۔ اخیر اخیر وقت تک بعض جاہ پسند لوگ اس میں شرکت کے لئے کوشاں تھے اور محرومی سے مایوس نہیں ھوئے تھے۔ لیکن دو مسلمانوں کی شان اس میں نرالی رھی۔ ایک مولانا ابوالکلام آزاد جو مشوروں میں شریک تھے، جلسوں میں شریک تھے مگر اس ڈیپوٹیشن میں شرکت منظور نہیں کی۔ حکیم صاحب وغیرہ نے ھر چند اصرار کیا۔ مگر ان کا انکار ھر اصرار پر غالب رھا۔ مگر اس سے زیادہ نرالی شان حسرت موھانی کی رھی مولانا آزاد والے طریق سے اپنی ذات کی بڑائی کا اظہار نمایاں ھوتا تھا۔ مگر حسرت نے یہ کیا کہ ایک طرف خاموشی کے ساتھ ڈیپوٹیشن میں شرکت کی اور وایسرائیگل ھال میں ڈیپوٹیشن کے ممبروں کے ساتھ موجود تھے۔ لیکن عرض معروض و جواب کے بعد جب وایسرائے سے ھاتھ ملانے کا «اعزازی» لمحہ آیا تو میں نے دیکھا کہ حسرت چپکے سے اٹھ کر بے ھاتھ ملائے کترا کر اس طرح نکل گئے کہ کسی نے دیکھا بھی نہیں۔

اب ۱۹۲۱ کا سال آیا جب گاندھی جی کانگریس پر چھائے تھے اور ادھر خلافت کے لیڈر محمد علی، شوکت علی ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر کچلو، ظفرعلی خان، تصدق شروانی، ڈاکٹر محمود، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی وغیرہ تھے۔ ترک موالات کا زور تھا۔ آخر دسمبر ۱۹۲۰ع گاندھی جی نے ہندوستان کے سوراج ملنے کی آخری تاریخ مقرر کی تھی۔ احمدآباد میں کانگریس کا یہ تاریخی جلسہ تھا۔ محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام آزاد نظربند تھے باقی حضرات شریک تھے۔ ڈاکٹر انصاری اور سید محمود کے ساتھ اجلاس میں، میں بھی تھا۔ اجلاس کے پنڈال سے باہر مسلمانوں کی قیامگاہ کے سامنے ایک شامیانے میں مغرب بعد خاص مسلمانوں کا جلسہ تھا۔ حکیم صاحب وغیرہ موجود تھے۔ گاندھی جی خاص طور سے مسلمانوں سے کچھ کہنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ اتنے میں دیکھا کہ کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی سے گھبرائے ہوئے بھاگتے ہوئے دو والنٹیر آئے اور گاندھی جی سے نہانت اضطراب کے ساتھ کہا، جلدی چلئے۔ سبجکٹ کمیٹی میں حسرت موہانی صاحب نے ہندوستان کے استقلال (انڈ پنڈنس) کی تجویز پیش کردی ہے اور کسی طرح واپس نہیں لے رہے ہیں۔ فضا میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیبی گولہ آکر پڑا ہے۔ چنانچہ گاندھی جی وغیرہ بھی گھبرائے ہوئے جلسہ سے اٹھ کر سبجکٹ کمیٹی میں چلے گئے۔

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

حسرت بدستور اپنی بات پر جمے رہے اور نوٹس دیا کہ وہ اس کو کھلے اجلاس میں پیش کریں گے۔ چنانچہ وہ وقت آیا جب کھلے اجلاس میں حسرت نے ہندوستان کے استقلال کی تجویز پیش کی اور آنکھوں نے دیکھا کہ ہزاروں کے مجمع میں ایک آواز بھی اس کی تائید میں نہیں اٹھی۔ پھر نیرنگ قدرت کا تماشا دیکھئے کہ آٹھ برس کے بعد لاہور کے اجلاس کانگریس میں ۱۹۲۹ع میں پنڈت جواہر لال نے یہی ریزولیشن پیش کیا اور کانگریس نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی خود مختاری کا پہلا اعلان حسرت موہانی کی زبان سے ہوا۔

پاکستان بننے کے بعد انہوں نے ہندوستان ہی میں قیام پسند کیا۔ اس کی پارلیمنٹ کے ممبر رہے اور تنہا وہ تھے جو پوری پارلیمنٹ کی مخالفت کے باوجود اپنی رائے کے اظہار میں بے باک تھے۔ نہ کسی کے غصہ پر دھیان اور نہ کسی کی ہنسی کی پرواہ۔ نہ کسی کی تحقیر پر افسوس نہ کسی کی نفرین کا جواب۔ ایک دھن تھی جو آن کو اپنی منزل مقصود کی طرف لئے چلی جارہی تھی۔

حسرت جیسی متضاد طبیعت کا انسان شاید ہی منصۂ شہود پر آیا ہو۔ سیاسیات اور قید و بند کے ساتھ شعر و سخن کی چمن بندی اور آبیاری بہت کم جمع ہوسکتی تھی۔ لیکن حسرت کے مزاج میں دونوں چیزیں جمع تھیں اور خود حسرت کو بھی اس اجتماع ضدّین پر تعجب تھا۔ جیسا

که اپنی ایک غزل میں انھوں نے کہا۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
کیا طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت کو نسیم دہلوی اور تسلیم لکھنوی کے سلسلہ سے شعر و سخن کی سجادگی ملی تھی۔ غزل کو لکھنؤ کے تصنع اور غالب کی مشکل گوئی کے کوچہ سے سادگی اور آسان گوئی اور حقیقت رسی کی منزل تک پھیر کر لانا شاعری میں حسرت کا تجدیدی کارنامہ ہے۔ حسرت کی ادبی تصنیفات میں ان کی شرح دیوان غالب بہترین چیز ہے اسی طرح متروکات اور شعر پر ان کے رسائل اور مقالات یادگاری چیزیں ہیں۔

حسرت کی زندگی کا تذکرہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی وفادار، شریف اور بہادر بیگم مرحومہ کے تذکرہ کے بغیر تمام نہیں ہوسکتا۔ آج سے پینتیس برس پہلے وہ چہرہ کھول کر نہایت سادہ لیکن پردہ پوش لباس میں باہر آتی تھیں اور کسی کی پرواہ نہیں کرتی تھیں۔ شوہر کی ہر قید و بند کے بعد جب ان کا کوئی مونس و مددگار نہیں ہوتا تھا ہر قسم کی مشکلوں کو بہادری اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنے میں شاید ہی کوئی مسلمان عورت ان کے مقابلہ کی نکل سکے۔ اللہ تعالی مغفرت فرمائے۔

سید فضل الحسن حسرت موہانی کی زندگی کے واقعات پر نظر کرکے ان کی شان حضرت ابوذر صحابی کی نظر آتی

ہے جن کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

«ابوذر سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہیں چمکی۔»

سچ یہ ہے کہ اس عہد پُرفریب میں حسرت سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہیں چمکی۔ اسی طرح حضرت ابوذر کے بعد یہ قول نبوی بھی ان پر صادق آتا ہے «کہ ابوذر کی حق گوئی نے اس کو زندگی میں تنہا چھوڑ دیا۔ اس کا کوئی ساتھی نہیں رہا» اور اس لئے اس عہد میں اس مقدس فقرہ کا مورد بھی حسرت کی ذات تھی۔

(رسالہ معارف دسمبر ۱۹۵۱ء)

مرزا فرحت اللہ بیگ

دهلی کا ایک یادگار مشاعرہ

حضور شاہ میں اهل سخن کی آزمایش هے
چمن میں خوشنوایان چمن کی آزمایش هے

نقیب کی آواز کے ساتھ هی سب اهل محفل دوزانو هو، سنبھل کر بیٹھ گئے اور پاس ادب سے سب نے گردنیں جھکالیں ۔ خواص نے بادشاہ سلامت کی غزل خریطہ میں سے نکالی، بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا اور بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا الفاظ کی نشست، زبان کی خوبی، مضمون کی آمد اور سب سے زیادہ پڑھنے والے کے گلے نے ایک سماں باندھ دیا ۔ ایک کیفیت تھی کہ زمین سے آسمان تک چھائی هوئی تھی ۔ کسی کو تعریف کرنے کا بھی هوش نہ تھا ۔ استادان فن هر شعر پر جھومتے تھے ۔ کبھی کبھی کسی کے منھ سے سبحان اللہ، سبحان اللہ کے الفاظ بہت نیچی آواز میں نکل گئے ورنہ ساری مجلس پر ایک عالم بیخودی طاری تھا ۔ مقطع پر تو یہ حال هوا کہ جیسے کسی نے سب پر جادو کر دیا ۔ هر شخص وجد میں جھوم رها تھا ۔ با اصرار تمام کئی کئی دفعہ مقطع پڑھوایا اور مضمون اور زبان کی چاشنی کا لطف اٹھایا ۔

غزل پڑھ چکنے کے بعد خواص نے کاغذ مرزا فخرو کے ہاتھ میں دیا۔ زرافشاں کاغذ پر خود حضرت ظل اللہ کے قلم کی لکھی ہوئی غزل تھی۔ خط ایسا پاکیزہ تھا کہ آنکھوں میں کھپا جاتا تھا۔ مرزا فخرو نے کاغذ لیکر ادھر آدھر دیکھا مملوک العلی نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا «صاحب عالم» ہمارا کیا منھ ہے جو ہم حضرت ظل سبحانی کی غزل کی جیسی چاہئے ویسی تعریف کرسکیں۔ البتہ ان نوازشات شاہی کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو حضرت پیر و مرشد نے غزل بھیج کر شرکائے مشاعرہ پر مبذول فرمائی ہیں۔ بارگاہ جہاں پناہی میں ہمارا ناچیز شکریہ پیش کرکے ہماری عزت افزائی فرمائی جائے۔ مرزا فخرو نے خواص کی طرف دیکھا اس نے عرض کی «قبلہ دوعالم» میں جاتے ہی پیشگاہ عالی میں پہنچادونگا۔ خواص آداب کرکے جانے ہی والا تھا کہ مرزا فخرو نے روکا اور کہا، جانے سے پہلے صاحب عالم وعالمیان حضرت ولیعہد بہادر کی غزل بھی پڑھتے جاؤ۔ چلتے چلتے مجھے عنایت کی تھی اور فرمایا تھا کہ کسی خوش گلو سے پڑھوانا۔ بھلا تم سے زیادہ موزوں اور کون شخص مل سکتا ہے۔ یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کر خواص کو دیا۔ اس نے آداب کرکے کاغذ لیا اور وہیں بیٹھ کر غزل سنائی۔

غزل تو بہت پھس پھسی تھی مگر ولی عہد بہادر کی غزل تھی بھلا کس کا جگر تھا جو تعریف نہ کرتا۔ البتہ

غالب اور مومن بالکل چپ بیٹھے رہے۔ بعض قلعہ والوں کو برا بھی معلوم ہوا مگر ان دونوں کو خوب سمجھتے تھے کہ یہ سچی تعریف کرنے والے لوگ ہیں ولیعہد تو ولیعہد اگر بادشاہ سلامت کی بھی غزل ہو تو گردن تک نہ ہلائیں۔ القصہ خواص تو غزل پڑھ کر رخصت ہوا اور اب حاضرین جلسہ کے پڑھنے کی نوبت آئی۔

مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا۔ اس نے دو شمعیں لا، شامیانے کے سامنے رکھدیں۔ صاحب عالم نے اپنی غزل نکالی اور ادھر آدھر نظر ڈال کر اور گردن کو ذرا جھکا کر کہا بھلا میری کیا مجال ہے کہ آپ جیسے کاملین فن کے مقابلہ میں پڑھنے کا دعوی کروں۔ البتہ جو کچھ برا بھلا کہا ہے وہ بہ نظر اصلاح عرض کرتا ہوں۔

غم وہ کیا ہے جو جاں گزا نہ ہوا
درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا

حال کھل جائیں غیر کے سارے
پر کروں کیا کہ تو مرا نہ ہوا

درد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر
بات کیا جس میں کچھ مزا نہ ہوا

وہ تو ملتا، پرائے دل کم ظرف
تجھ کو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا

شکوہ یار اور زبان رقیب
کھیل ٹھہرا کوئی گلہ نہ ہوا

تم رہو اور مجمع اغیار

میرا کیا ہے، ہوا، ہوا نہ ہوا

پھر تمہارے ستم اٹھانے کو

رمز اچھا ہوا برا نہ ہوا

مرزا فخرو کی آواز تو اونچی نہ تھی۔ مگر پڑھنے میں ایسا درد تھا کہ سنکر دل بے قابو ہو جاتا تھا۔ سارا مشاعرہ واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور سے گونج رہا تھا۔ تیسرے شعر پر مرزا غالب اور پانچویں پر حکیم مومن نے ایسے جوش سے واہ واہ کی کہ صف سے آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو اپنی غزل پڑھتے رہے مگر ان دونوں کو انھی دو شعروں کی رٹ لگی رہی۔ پڑھتے اور مزے میں آکر جھومتے۔ جب غزل ختم ہوئی تو مرزا نوشہ نے کہا، سبحان اللہ صاحب عالم! سبحان اللہ! واہ کیا کہنا ہے۔ شعر یوں کہتے ہیں۔ مزا آگیا۔ استاد ذوق مسکرائے کہ چلو اسی بہانے سے میری تعریف ہو رہی ہے۔ مرزا فخرو نے اٹھ کر سلام کیا اور کہا «یہ آپ اصحاب کی بزرگانہ شفقت ہے جو اس طرح ارشاد ہوتا ہے ورنہ من آنم کہ من دانم» وہ جدھر نظر ڈالتے لوگ تعریفیں کرتے اور وہ جھک جھک کر سلام کرتے۔ اب حکیم سید محمد تعشق کے پڑھنے کا نمبر آیا۔ یہ بڑے پایہ کے ادیب ہیں ۶۳، ۶۴ برس کی عمر ہے حکمت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ غرض کیا کہوں ایک جامع کمالات شخص ہیں۔ مگر اپنے آپ کو بہت دور کھینچتے

ھیں اچھا شعر سنتے ھیں تو بے تاب ھو جاتے ھیں چاھتے کہ جس طرح میں تعریف کرتا ھوں دوسرے بھی میرے شعر کی تعریف کریں۔ شعر برا نہیں کہتے مگر ایسا بھی نہیں ھوتا کہ مشاعرہ چمك اٹھے اور ھر شخص کے منھ سے بیساختہ واہ واہ نکل جائے آپ خود ھی ان کا کلام دیکھ لیجئے۔

تجھ کو اس میری آہ وزاری پر رحم اے فتنہ گر نہیں آتا
تیرے بیمار کا ھے یہ عالم ھوش دو دو پھر نہیں آتا
وعدہ شام تو کیا لیکن کچھ وہ آتا نظر نہیں آتا

تعریف تو ھوئی مگر کچھ ان کے دل کو نہ لگی اس لئے ذرا آزردہ سے ھوگئے۔

ان کے بعد شمع میر حسین تجلی کے سامنے آئی۔ یہ میر تقی میر کے پوتے ھیں بڑے ظریف اور نکتہ سنج آدمی ھیں۔ کلام میں وھی میر صاحب کا رنگ جھلکتا ھے۔ زبان پر جان دیتے ھیں غزل تو چھوٹی سی ھوتی ھے مگر جو کچھ کہتے ھیں اچھا کہتے ھیں۔ کیوں نہو آخر کس کے پوتے ھیں۔

مری وفا پہ تجھے روز شك تھا اے ظالم
یہ سر، یہ تیغ ھے، لے ابتو اعتبار آیا
یہ شوق دیکھو پس مرگ بھی تجلی نے
کفن میں کھولدیں آنکھیں سنا جو یار آیا

دوسرے شعر پر وہ تعریف ھوئی کہ میاں تجلی کی باچھیں کھل گئیں۔ میاں تجلی پڑھ چکے تو حکیم سکھانند رقم

کی باری آئی، ان کو حکیم مومن خاں صاحب کے مکان پر دیکھ چکا تھا۔ کلام تو ایسا اچھا نہیں ہوتا مگر پڑھتے خوب ہیں جہاں کسی نے ذرا بھی تعریف کی اور انھوں نے سلام کا تانتا باندھ دیا۔ غزل لکھی تھی

بجھانا آتش دل کا بھی کچھ حقیقت ہے
ذرا سا کام تجھے چشم تر نہیں آتا

عدم سے کوچہ قاتل کی راہ ملحق ہے
گیا ادھر جو گذر پھر ادھر نہیں آتا

ہو خاک چارہ گری اس مریض کی تیرے
نظر میں تجھ سا کوئی چارہ گر نہیں آتا

تیسرا شعر حکیم مومن خاں صاحب کے رنگ کا تھا، اس کی انھوں نے بہت تعریف کی، مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا «میاں رقم یا تو تم حکمت ھی کرو یا شعر ھی کہو۔ ان دونوں چیزوں کو ملاکر چلانا ذرا مشکل کام ہے۔

شمع کا شیخ نیاز احمد جوش کے سامنے جانا تھا کہ شاگردان ذوق ذرا سنبھل بیٹھے جوش کو استاد ذوق بہت عزیز رکھتے ھیں ان کی عمر ۱۸، ۱۹ سال کی ہے۔ مگر بلا کے طباع اور ذھین ھیں۔ ان کی سخن گوئی اور سخن فہمی کی قلعے بھر میں دھوم ہے، مگر مشاعرے میں انھوں نے جو غزل پڑھی وہ تو مجھے کچھ پسند نہ آئی، ھاں قلعہ والوں نے واہ واہ کے شور سے مکان سر پر اٹھا لیا استاد ذوق نے بھی سبحان اللہ کہہ کر شاگردوں کا دل بڑھایا

غزل دیکھ لیجئے ممکن ہے کہ میں نے ہی غلط اندازہ لگایا ہو۔

کیوں کر وہ ہاتھ آئے کہ یاں زور و زر نہیں
لے دے کے ہے اک آہ سو اس میں اثر نہیں
قسمت سے درد بھی تو ہوا وہ ہمیں نصیب
جس درد کا کہ چارہ نہیں، چارہ گر نہیں
قسمت ہی میں نہیں ہے شہادت وگرنہ یاں
وہ زخم کونسا ہے کہ جو کارگر نہیں
سجدے میں کیوں پڑا ہے ارے اٹھ شراب پی
اے جوش میکدہ ہے خدا کا یہ گھر نہیں

آپ نے غزل ملاحظہ کرلی۔ میں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ کوئی شعر بھی ایسا نہیں ہے جو تعریف کے قابل ہو اب زبر دستی کی تعریفیں کرنا دوسری بات ہے۔

ان کے بعد مولوی امام بخش صہبائی کے بڑے فرزند محمد عبدالعزیز کا نمبر آیا۔ یہ عزیز تخلص کرتے ہیں۔ غزل خوب کہتے ہیں کیوں نہ ہو بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ ہائے کیا کیا شعر نکالے ہیں! لکھتے ہیں۔

جوں شمع شغل تیرے سراپا نیاز کا
جلنا جو سوز کا ہے تو رونا گداز کا
کج فہمیوں سے خلق کی دیکھا کہ کیا ہوا
منصور کو حریف نہ ہوتا تھا راز کا

ہم عاصیوں کا بار گنہ سے جھکا ھے سر
اور خلق کو گمان ھے ہم پر نماز کا
مغرور تھا ھی اور وہ مغرور ہو گیا
اس میں گلہ نہیں مجھے آئینہ ساز کا
اوروں کے ساتھ لطف سے تھا صورت نیاز
یاں بڑھ گیا دماغ تغافل سے ناز کا

ذرا سچ کہئے گا ساری کی ساری غزل مرصع ھے یا نہیں۔ ھاں اس غزل کی جو کچھ تعریف ہوئی وہ بجا ہوئی۔ استاد ذوق نے بھی کہا، بھئی صہبائی تمہارا یہ لڑکا غضب کا نکلا ھے۔ خدا اس کی عمر میں برکت دے۔ ایک دن بڑا نام پیدا کرے گا۔ واہ میاں صاحبزادے واہ! کیا کہنا ھے! دل خوش ہوگیا کیوں نہ ہو ایسوں کے ایسے ھی ہوتے ھیں میاں عزیز نے اٹھ سلام کیا اور بیٹھ گئے۔

اس کے بعد منشی محمد علی کے پڑھنے کی باری تھی۔ چوبدار نے شمع سامنے رکھدی۔ جب شمع کی روشنی آنکھوں پر پڑی تو میاں تشنہ نے آنکھیں کھولیں۔ کچھ سمجھ کر پھونک مار کر شمع گل کردی اور کہا میں بھی کچھ عرض کروں؟ سب نے کہا «ضرور فرمائیے» انہوں نے آزادانہ لہجہ میں کچھ گاتے ہوئے کچھ پڑھتے ہوئے یہ غزل سنائی۔

آنکھ پڑتی ھے کہیں پاؤں کہیں پڑتے ھیں
سب کی ھے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں

شمع ہے، گل بھی ہے، بلبل بھی ہے پروانہ بھی
رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں

حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

نیستی کی ہے مجھے کوچۂ ہستی میں تلاش
سیر کرتا ہوں ادھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں

ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ
فائدہ رونیسے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

میں کیا بتاؤں کہ اس غزل کا کیا اثر ہوا۔ ایک سناٹا تھا کہ آسمان تک چھایا ہوا تھا۔

غزل کا مضمون، آدھی رات کی کیفیت، پڑھنے والے کی حالت غرض یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا ہے۔

ادھر یہ عالم طاری تھا ادھر میاں تشنہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے اور «کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں» کہتے ہوئے اٹھے اسی عالم بیخودی میں دروازے سے باہر نکل گئے۔ ان کی کچھ «کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں» کی آواز بڑی دیر تک کانوں میں گونجتی رہی۔ جب ذرا طبعتیں سنبھلیں تو سب کے منھ سے بے اختیار یہی نکلا کہ «واقعی کچھ بھی نہیں»۔

مرزا فخرو نے شمع منگا کر روشن کی اور کہا «ہاں صاحب پھر شروع کیجئے ----

ہاں ان کے بعد جس کے سامنے شمع آئی وہ نوجوان سہی مگر شاعر ہے اور ایسا شاعر ہوگا کہ ہندوستان بھر میں نام کرے گا۔ بھلا کونسا مشاعرہ ہے جس میں مرزا قربان علی بیگ سالک کی غزل شوق سے نہیں سنی جاتی اور کونسا شعر ہوتا ہے جو بار بار نہیں پڑھوایا جاتا۔ جو ایک دفعہ بھی کسی مشاعرہ میں گیا ہے وہ ان کو دور سے پہچان لیگا۔ چھوٹا سا قد، دبلے پتلے ہاتھ پاؤں، موٹی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، موٹی جلد، گندمی رنگ، اس پر چیچک کے داغ، چھدری چھوٹی سی داڑھی، کلوں پر کم ٹھوڑی پر ذرا زیادہ، سر پر خشخاشی بال، کوئی تیس سال کی عمر۔ بس بخارا کے ترک معلوم ہوتے ہیں۔ ہاں لباس ان لوگوں سے مختلف ہے۔ نیچی چولی کا انگرکھا، تنگ مہری کا پائجامہ، سر پر سفید گول ٹوپی، ہاتھ میں سفید لٹھے کا رومال۔ شمع کا ان کے سامنے آنا تھا کہ سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بھی انگرکھے کی آستین الٹ، ٹوپی کو اچھی طرح جما اپنے استاد مرزا غالب کی طرف دیکھا۔ ادھر سے آدھر مسکرا کر کچھ اشارہ ہوا تو انہوں نے صاحب عالم کی طرف دیکھ کر عرض کی «اجازت ہے۔» مرزا فخرو نے کہا «ہاں میاں سالک پڑھو، آخر اس میں اجازت کی ضرورت ہی کیا۔» سالک نے جیب سے کاغذ نکالا، کچھ الٹا پلٹا، پھر ایک بار سنبھل کر کہا «عرض کیا ہے۔»

انتہا صبر آزمائی کی ہے درازی شب جدائی کی

ہے برائی نصیب کی، کہ مجھے — تم سے امید ہے بھلائی کی
نقش ہے سنگ آستاں پہ ترے — داستاں اپنی جبہ سائی کی
ہے فغاں بعد امتحان فغاں — پھر شکایت ہے پارسائی کی
کیا نہ کرتا وصال شادی مرگ — تم نے کیوں مجھ سے بیوفائی کی
راز کھلتے گئے مرے سب پر — جس قدر اس نے خود نمائی کی
کتنے عاجز ہیں ہم کہ پاتے ہیں — بندے بندے میں بو خدائی کی
رہ گئیں دلمیں حسرتیں سالک — آ گئی عمر پارسائی کی

ایک ایک شعر پر یہ عالم تھا کہ مجلس لوٹی جاتی تھی۔ ایک ایک شعر کئی کئی بار پڑھوایا جاتا تھا۔ ایک ایک لفظ پر تعریفیں ہوئیں اور ایک ایک بندش کی داد ملی۔ استاد ذوق نے تیسرے شعر پر کہا «واہ میاں سالک کیا کہنا ہے! سب ہی جبہ سائی باندھتے آئے ہیں، تمہاری داستان کو کوئی نہیں پہنچا۔ کیا کلام ہے! کیا روانی ہے! سبحان اللہ! حکیم مومن خاں نے کہا «میاں سالک! یہ جوانی اور مقطع میں یہ بوڑھا مضمون! تمہاری «عمر پارسائی» کو بہت دن پڑے ہیں۔ ابھی سے تو بڈھوں کی سی باتیں نہ کیا کرو» میاں سالک نے جواب دیا۔ استاد میں تو جوانی ہی میں بڈھا ہوگیا۔ دیکھئے بڑھاپا دیکھنا نصیب بھی ہوتا ہے یا نہیں پھر دل میں آئے ہوئے مضمون کیوں چھوڑوں۔ بعد میں کون دیکھا پھرے گا کہ یہ شعر بڈھے نے کہا تھا یا جوان نے ہم نہ رہیں گے مضمون رہ جائے گا۔۔۔

ہوتے ہوتے میاں عارف کا نمبر آ ہی گیا۔ بھلا ان

کو مشاعرے کے انتظام سے کب فرصت تھی جو غزل لکھتے۔ پھر بھی چلتے پھرتے کچھ لکھ ھی لیا تھا۔ وھی پڑھ دیا۔ اس دن رات کی گردش کے بعد اتنا بھی لکھ لینا کمال ھے۔ غزل تھی۔

اٹھتا قدم جو آگے اے نامہ بر نہیں
پیچھے تو چھوڑ آئے کہیں اس کا گھر نہیں
اور دل کو ھو تو ھو، ھمیں مرنے سے ڈر نہیں
خط لیکے ھم ھی جاتے ھیں گر نامہ بر نہیں
بے التفاتیوں کا ترے شکوہ کیا کریں
اپنے ھی جبکہ نالۂ دل میں اثر نہیں

مطلع کی سب نے تعریف کی۔ استاد احسان نے کہا میاں عارف! میں بھی شعر کہتے کہتے بڈھا ھوگیا ھوں۔ لاکھوں شعر سنے، لاکھوں سنائے، مگر یہ مضمون بالکل نیا ھے اور کس خوبی سے ادا کیا ھے کہ دل خوش ھوگیا۔

اب شمع مولانا صہبائی کے روبرو آئی۔ ان کی علمیت کا ڈنکا تمام ھندوستان میں بج رھا تھا۔ ایسے جامع الکمال آدمی کہاں پیدا ھوتے ھیں۔ ھزاروں شاگرد ھیں اکثر ریختہ کہتے ھیں۔ ان کو اصلاح دیتے ھیں اور خوب دیتے ھیں۔ مگر خود ان کا کلام تمام وکمال فارسی ھے۔ میں نے تو ریختے میں نہ کبھی ان کی کوئی غزل دیکھی نہ سنی اور مشاعرہ میں بھی فارسی ھی کی غزل پڑھی۔ خوب خوب تعریفیں ھوئیں۔ مگر ایمان کی بات یہ ھے لوگوں کو مزا نہ آیا۔

اهاھا! زبان کا لطف اٹھانا ھے تو اب سید ظہیرالدین خاں ظہیر کو سنئیے۔ ابھی ۳۰ - ۳۲ سال کی عمر ھے مگر کلام میں خدا نے وہ اثر دیا ھے کہ واہ واہ۔ استاد ذوق کی اصلاح نے اور سونے پر سہاگہ کا کام کیا ھے شکل و صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان کی طبیعت اس بلا کی ھے۔ قد خاصا اونچا، چھریرا بدن، کشادہ سینہ، سانولی رنگت، کشادہ ذھن، اونچی ستوان کی ناك، آنکھیں نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی مگر روشن، گول داڑھی نہ بہت گھنی نہ بہت چھدری، سر پر پٹے، لباس میں انگرکھا، تنگ مہری کا سفید پائجامہ، گون ٹوپی۔ خوش مزاج اور لطیفہ سنج ایسے کہ منھ سے پھول جھڑتے ھیں۔ پڑھنے کا بھی ایك خاص طرز ھے۔ لکھنؤ والوں کے تحت اللفظ پڑھنے سے ملتا جلتا ھے۔ ساتھ ھی اشارون سے ایك ایك لفظ کو سمجھاتے جاتے ھیں۔ غزل ہوئی تھی۔

جبیں اور شوق اس کے آستاں کا
ارادہ اور ارادہ بھی کہاں کا
لٹا ھے قافلہ تاب و تواں کا
خدا حافظ ھے دل کے کارواں کا
مری درماندگی منزل رساں ھے
سراغ نقش پا ہوں کارواں کا
رھے پابند دل کے دل میں ارماں
قدم منزل نے پکڑا کارواں کا

اٹھا سکتے نہیں سر آستاں سے
غضب ہے بار منت پاسباں کا

ہمیشہ مورد برق و بلا ہوں
مٹے جھگڑا الٰہی آشیاں کا

دل بیتاب نے وہ بھی مٹایا
کسی کو کچھ جو دھوکا تھا فغاں کا

ظہیر آؤ چلو اب میکدہ کو
نکالا زہد و تقوی ہے کہاں کا

اور تو اور استادان فن نے اس غزل کی ایسی داد دی کہ میاں ظہیر کا دل غنچے کی طرح کھل گیا۔ تیسرے شعر پر تو یہ حالت تھی کہ تعریفوں کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ سلام کرتے کرتے بچارے کے ہاتھ دکھ گئے ہوں گے۔ جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی جانب کی شمع نواب مصطفے خاں شیفتہ کے سامنے آئی۔ ان کا کیا کہنا! استاد فن میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مومن کے شاگرد ہیں، مگر خود استاد ہیں۔ انہوں نے کسی شعر کی ہی تعریف کی اور اس کی وقعت بڑھی۔ یہ سن کر ذرا خاموش ہوئے اور شعر دوسروں کی نظر سے بھی گر گیا۔ زبان کے ساتھ مضمون کی ترتیب دینا ایسے ہی لوگوں کا کام ہے۔ پڑھتے بھی ہیں تو ایک ایک لفظ سمجھا سمجھا کر۔ آواز ایسی اونچی ہے کہ دور اور پاس سب کو صاف سنائی دے۔ غزل پڑھنے سے پہلے ادھر آدھر دیکھا۔ ذرا انگرکھا درست کیا، ٹوپی

درست کی، انگرکھے کی آستینوں کو چڑھایا اور یہ غزل پڑھی۔

آرام سے ہے کون جہان خراب میں
گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

سب اس میں محو اور یہ سب سے علاحدہ
آئینہ میں ہے آب، نہ آئینہ آب میں

معنی کی فکر چاہئے صورت سے کیا ہول
کیا فائدہ ہے موج اگر ہے شراب میں

ذات و صفات میں بھی یہی ربط چاہئے
جوں آفتاب روشنی آفتاب میں

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا
وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

بیباک شیوہ، شوخ طبیعت، زباں دراز
ملزم ہوا ہے پر نہیں، عاجز جواب میں

تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو مگر حضور
اس وقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

غزل تو ایسی ہے کہ بھلا کس کا منہ ہے جو تعریف کا حق ادا کرسکے۔ مگر تعریف بڑی سنبھل سنبھل کر کی گئی۔ بڑے مشاعرے میں میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ نومشقوں کے دل تو تعریفوں سے خوب بڑھاتے ہیں، مگر جب استادوں کے پڑھنے کی نوبت آتی ہے تو وہ جوش وخروش نہیں رہتا بلکہ جوش کے بجائے متانت زیادہ آجاتی ہے۔ استادوں کے انہی شعروں کی تعریف ہوتی ہے جو واقعی تعریف کے

قابل ہوں۔ اگر کسی شعر کی ذرا بے جا تعریف کردی جائے تو اس سے ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ صرف اسی کلام کی تعریف چاہتے ہیں جس کو یہ خود سمجھتے ہیں کہ اس کی تعریف ہونی چاہئے۔ شعر پڑھکر اگر دیکھتے بھی ہیں تو اپنے برابر والوں کی طرف اور وہی داد بھی دیتے ہیں۔ مشاعرے کے باقی لوگ ان کے کلام سے لطف ہی نہیں اٹھاتے کچھ حاصل بھی کر لیتے ہیں۔ ان کے لئے یہ غزلیں کسی طرح استاد کی اصلاح سے کم نہیں ہوتیں۔

شمع مفتی صدرالدین صاحب آزردہ کے سامنے پہنچی۔ اس پائے کے عالم شاعر نہیں ہوتے اور ہوتے ہیں تو استاد ہوجاتے ہیں۔ مفتی صاحب کے جتنے شاگرد ہیں جید عالم ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ ان کے تلامذہ شاعر ہیں اور وہ شاعر بھی کیسے کہ بڑے پائے کے۔ مفتی صاحب کہتے خوب ہیں مگر پڑھتے اس طرح ہیں گویا طالب علموں کو سبق دے رہے ہیں اور آواز ذرا نیچی ہے لیکن ان کی وجاہت کا یہ اثر ہے کہ مشاعرے میں سناٹا ہوتا ہے۔ اور تعریف بھی ہوتی ہے تو خاص خاص شعروں پر اور بہت نیچی آواز میں۔ ہاں مرزا نوشہ ان سے مذاق کرنے میں نہیں چوکتے۔ کبھی کبھی اعتراض بھی کر بیٹھتے ہیں اور مزے مزے کی نوک جھونک ہوجاتی ہے۔ غزل ملاحظہ ہو۔ کیا پختہ کلام ہے!

باتوں سے کب ترو بالا جہاں نہیں
کب آسماں زمیں و آسماں نہیں

افسردہ دل نہو در رحمت نہیں ہے بند
کس دن کھلا ہوا در پیر مغاں نہیں

شب اس کو حال دل نے جتایا کچھ اسطرح
ہیں لب تو کیا، نگہہ بھی ہوتی ترجماں نہیں

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

کٹتی کسی طرح بھی نہیں یہ شب فراق
شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

کہتا ہوں اس سے کچھ میں نکلتا ہے منہ سے کچھ
کہنے کو یوں تو ہے گی زباں اور زباں نہیں

آزردہ ہونٹ تک نہ ھلے اس کے روبرو
مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

آزردہ جیسے استاد کے بعد نواب مرزا خاں داغ کا پڑھنا ایک عجیب چیز ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ اوّل تو داغ کو سب چاہتے ہیں، دل بڑھاتے ہیں۔ اور جانتے ہیں کہ کسی دن یہی داغ ہندوستان کا چراغ ہوگا۔ دوسرے مرزا فخرو کے خیال سے ان کو استادوں میں جگہ ملی تھی۔ مگر انھوں نے غزل بھی ایسی پڑھی کہ استاد بھی قائل ہوگئے۔ ۱۷-۱۸ برس کے لڑکے کا اس قیامت کی غزل اور اس جرأت سے پڑھنا واقعی کمال ہے۔ میری تو رائے ہے کہ جو زبان داغ نے لکھی ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوگی۔ ذرا زبان کی شوخی، مضمون کی رنگینی اور طبیعت کی روانی ملاحظہ

کیجئے۔ اور داد دیجئے۔

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں ناز والے نیاز کیا جانیں
کب کسی در پہ جبہ سائی کی شیخ صاحب نماز کیا جانیں
جو رہ عشق میں قدم رکھیں وہ نشیب و فراز کیا جانیں
پوچھئے میکشوں سے لطف شراب یہ مزا پاکباز کیا جانیں
جن کو اپنی خبر نہیں اب تک وہ مرے دل کا راز کیا جانیں
حضرت خضر جب شہید نہ ہوں لطف عمر دراز کیا جانیں
جو گذرتے ہیں داغ پر صدمے آپ بندہ نواز کیا جانیں

اللہ اللہ! وہ سہانا وقت، وہ چھوٹی سی آواز، وہ دلکش سر، وہ الفاظ کی نشست، وہ بندش کی خوبصورتی اور سب سے زیادہ یہ کہ داغ کی بھولی بھالی شکل۔ ایک عجیب لطف دے رہی تھی۔ ساری محفل میں کوئی نہ تھا جو محو حیرت نہ ہوگیا ہو اور کوئی نہ تھا جس کے منھ سے جزاک اللہ، سبحان اللہ اور صلی علی کے الفاظ بیساختہ نہ نکل رہے ہوں۔ مرزا فخرو کی تو یہ حالت تھی کہ گھڑی گھڑی پہلو بدلتے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے تھے۔ غزل ختم ہوئی اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ کب ختم ہوگئی۔ جب شمع حکیم مومن خاں مومن کے سامنے پہنچ گئی اسوقت لوگوں کا جوش کم ہوا۔ اور اس ریختہ کے استاد کا کلام سننے کو سب ہمہ تن گوش ہوگئے۔ انھوں نے شمع اٹھا کر ذرا آگے رکھی۔ ذرا سنبھل کر بیٹھے۔ بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی۔ ٹوپی کو کچھ ترچھا کیا۔ آستینوں

کی چنٹ کو صاف کیا اور بڑی دردانگیز آواز میں دل پذیر ترنم کے ساتھ یہ غزل پڑھی۔

الٹے وہ شکوہ کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذر جفا کے ساتھ
مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ
ہے کس کا انتظار کہ خواب عدم سے بھی
ہر بار چونک پڑتے ہیں آواز پا کے ساتھ
سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر
یوں روئے زار زار تو اہل عزا کے ساتھ
اس کی گلی کہاں، یہ تو کچھ باغ خلد ہے
کس جائے مجھ کو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ
اللہ رے گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

شاعری کیا تھی، جادو تھا۔ تمام لوگ ایک عالم محویت میں بیٹھے تھے۔ وہ خود بھی اپنے کلام کا مزا لے رہے تھے جس شعر میں ان کو زیادہ لطف آتا تھا اس کے پڑھتے وقت ان کی انگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں میں چلنے لگتی تھیں۔ بہت جوش ہوا تو کاکلوں کو انگلیوں میں مروڑنے لگے۔ کسی نے تعریف کی تو گردن جھکا کر ذرا مسکرا دئے۔ پڑھنے کا طرز بھی سب سے جدا تھا ھاتھ۔ بہت کم ہلاتے تھے اور ہلاتے بھی کیسے، ھاتھوں کو بالوں سے کب فرصت تھی

هاں آواز کے زیرو بم اور آنکھوں کے اشاروں سے جادوسا کرتے جاتے تھے۔ غزل ختم ہوئی تو تمام شعرا نے تعریف کی۔ سنکر مسکرائے اور کہا۔ آپ لوگوں کی یہی عنایت تو ہماری ساری محنت کا صلہ ہے۔ میں تو عرض کرچکا ہوں۔

هم داد خواں ہیں نہیں طالب زر کچھ
تحسین سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

جب یہ پڑھ چکے تو مرزا غالب کی باری آئی۔ رنگ ہی دوسرا تھا۔ صبح ہوچلی تھی شمع کے سامنے آتے ہی فرمانے لگے «صاحبو! میں بھی بھیرویں الاپتا ہوں» یہ کہکر ایسے دلکش اور موثر لہجے میں غزل پڑھی کہ ساری محفل محو ہوگئی۔ آواز بہت اونچی اور رسیلی تھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدردان نہیں پاتے۔ اس لئے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ غزل تھی۔

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے   آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار   یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منھ میں زبان رکھتاہوں   کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود   پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
سبزہ وگل کہاں سے آئے ہیں   ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید   جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
هاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا   اور درویش کی صدا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب   مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

شمع استاد ذوق کے سامنے پہنچ گئی - استاد نے مرزا فخرو کی طرف دیکھ کر کہا - صاحب عالم غزل پڑھوں یا کل جو قطعہ ہوا ہے وہ عرض کروں - کل رات خدا جانے کیا بات تھی کہ کسی طرح نیند نہ آتی تھی - لوٹتے لوٹتے صبح ہوگئی ، شب ہجر کا مزا آگیا - اسی کشاکش میں ایک قطعہ ہوگیا ہے - اگر اجازت ہو تو عرض کروں مرزا فخرو نے کہا ، استاد آج کا مشاعرہ سب بندوں سے آزاد ہے - غزل پڑھئے ، قصیدہ پڑھئے ، قطعہ پڑھئے - غرض جو دل چاہے پڑھئے - ہاں کچھ نہ کچھ پڑھئے ضرور - استاد ذوق سنبھل کر بیٹھ گئے اور یہ قطعہ ایسی بلند اور خوش آیند آواز میں پڑھا کہ محفل گونج اٹھی اور ان کے پڑھنے کی آواز نے کلام کی تاثیر میں اور زیادہ زور پیدا کردیا -

کہوں کیا ذوق احوال شب ہجر
کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر
مرے بخت سیہ کی تیرگی نے
تپ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم
اور آئے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کے فلک سے
کہ او بے مہر بد اختر کمینے

کہاں میں اور کہاں یہ شب مگر تھے
مری جانب سے تیرے دل میں کینے
سو اس ظلمت کے پردے میں کئے ظلم
ارے ظالم تری کینہ دری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج
پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے
قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سن کر
پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا
مجھے بیتابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ
بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ
بہت سی جان توڑی جاکنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی
طلوع صبح سے منھ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ھجر کی رات
یقیں ھے صبح تک دے گی نہ جینے
لگے پانی چوانے منھ میں آنسو
پڑھی یاسین سرھانے بیکسی نے

مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی
لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریب خانہ میرے
اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
بشارت مجھکو صبح وصل کی دی
اذاں کے ساتھ یمن و فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر
کہ خوش ہوکر کہا یہ خود خوشی نے
موذن مرحبا بر وقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

آخری شعر پر پہنچے تھے کہ برابر کی مسجد سے آواز آئی «اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر! اس کے ساتھ ھی سب نے دعا کو ھاتھ اٹھائے۔ دعا سے فارغ ھوکر مرزا فخرو نے کہا۔ صاحبو! کچھ عجیب اتفاق ھے کہ فاتحہ خیر ھی سے یہ مشاعرہ شروع ھوا تھا۔ اور اب فاتحہ ھی پر ختم ھوتا ھے۔ یہ کہکر انہوں نے دونوں شمعوں کو جو چکر کھا کر ان کے سامنے آئی تھیں بجھا دیا شمعوں کے گل ھوتے ھی نقیبوں نے آواز دی کہ حضرات مشاعرہ ختم ھوا۔

«مضامین فرحت»

رشید احمد صدیقی

چارپائی

چارپائی اور مذہب ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے - ہم اسی پر پیدا ہوتے ہیں اور یہیں سے مدرسہ، آفس؛ جیل خانے کونسل یا آخرت کا راستہ لیتے ہیں - چارپائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے - ہم اس پر دوا کھاتے ہیں، دعا اور بھیک بھی مانگتے ہیں - کبھی فکر سخن کرتے ہیں اور کبھی فکر قوم - اکثر فاقہ کرنے سے باز نہین آتے - ہم کو چارپائی پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا برطانیہ کو آئی سی ایس پر، شاعر کو قافیہ پر یا طالب علم کو غل غپاڑے پر!

چارپائی کی پیڑھی دور چل کر دیوجانس کلبی کے خم سے جا ملتی ہے - کہا جاتا ہے کہ تمام دنیا سے منھ موڑ کر دیوجانس ایک خم میں جا بیٹھا - ہندوستانی تمام دنیا کو چارپائی کے اندر سمو لیتا ہے - ایک نے کثرت سے وحدت کی طرف رجوع کیا، دوسرے نے وحدت میں کثرت کو سمیٹا!

ہندوستانی ترقی کرتے کرتے تعلیم یافتہ جانور ہی کیوں نہ ہوجائے اس سے اس کی چارپائیت نہیں جدا کی

جا سکتی۔ اس وقت ہندوستان کو دو معرکے در پیش ہیں، ایک سوراج کا دوسرا تعلیم یافتہ بیوی کا۔ در اصل سوراج اور تعلیم یافتہ بیوی دونوں ایک ہی مرض کی دو علامتیں ہیں دونوں چارپائیت میں مبتلا ہیں۔ سوراج تو وہ ایسا چاہتا ہے جس میں انگریز کو حکومت کرنے اور ہندوستانی کو گالی دینے کی آزادی ہو۔ اور بیوی ایسی چاہتا ہے جو گریجوٹ ہو لیکن گالی نہ دے!

ارسطو پر ہندوستانی شوہر اور تعلیم یافتہ بیوی کے درمیان جو کھینچ تان ملتی ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ شوہر چارپائی پر سے حکومت کرنا چاہتا ہے اور بیوی ڈرائنگ روم سے گھنٹی بجاتی ہے۔ تعلیم یافتہ بیوی اپنے شہریت کی آرزو مند ہوتی ہے۔ دوسری طرف شوہر یہ چاہتا ہے کہ بیوی تو صرف فرد خاندان ہونے پر صبر کرے اور خود فخر خاندان نہیں بلکہ فخر کائنات قرار دیا جائے۔ شوہر چوپایہ بننا چاہتا ہے اور بیوی کو چارپائی رکھنا چاہتا ہے۔

موتی لال نہرو رپوٹ سے پہلے ہندوستانیوں پر دو مصیبت نازل تھی۔ ایک ملیریا کی دوسری مس میو المعروف بہ مادر ہند کی۔ ملیریا کا انسداد کچھ تو کونین سے کیا گیا، بقیہ کا کثرت اموات سے۔ مس میو کے تدارک میں ہندو مسلمان دونوں چارپائی پر سر بزانو ہیں۔ نہرو رپوٹ اور مادر ہند دونوں میں ایک نسبت ہے۔ ایک نے مسلمانوں کے

سیاسی حقوق کو اہمیت نہ دی، دوسری نے ہندوؤں کے معاشرتی رسوم و روایات کی پردہ دری کی۔

مادر ہند کے بارہ میں چارپائیئیں کی یہ رائے ہے کہ اس کتاب کے شائع ہونے سے ان کو ہندوستانیوں سے زیادہ مس میو کے بارے میں رائے قائم کرنے کا موقعہ ملا۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر سارے ہندوستان سے شمار و اعداد اور مواد اکٹھا کرنے کے بجائے موصوفہ نے صرف ہم ہندوستانیوں کی چارپائی کا جائزہ لیا ہوتا تو ان کی تصنیف اس سے زیادہ دلچسپ ہوتی جتنی کہ اب ہے۔

چارپائی ہندوستانیوں کی آخری جائے پناہ ہے۔ فتح ہو یا شکست وہ بھاگے گا ہمیشہ چارپائی ہی کی طرف۔ پھر وہ چارپائی پر لیٹ جائے گا۔ گائے گا، گالی دے گا۔ یا مناجات پڑھنا شروع کردے گا۔

فن جنگ یا فن صحافت کی رو سے آج کل اس طرح کی باتیں ضروری اور مفید خیال کی جاتی ہیں۔ جس طرح ہر مالدار خوش نصیب یا عقلمند نہیں ہوتا اسی طرح ہر چارپائی چارپائی نہیں ہوتی. کہنے کو تو پلنگ، پلنگڑی، چپرکھٹ مسہری، سب پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے لیکن ہمارے سیاسی لیڈروں کے سیاسی اور مولویوں کے مذہبی تصور کے مانند چارپائی کا صحیح مفہوم اکثر متعین نہیں ہوتا۔

چارپائی کی مثال ریاست کے ملازم سے دی جاتی ہے۔ یہ ہر کام کے لئے ناموزوں ہوتا ہے اس لئے ہر کام

پر لگا دیا جاتا ھے۔ ایک ریاست میں کوئی صاحب «ولایت پاس» ھوکر آئے۔ ریاست میں کوئی اسامی نہ تھی جو ان کو دیجاسکتی۔ آدمی سوجھ بوجھ کے تھے۔ راجہ صاحب کے کانوں تک یہ بات پہنچا دی کہ کوئی جگہ نہ ملی تو وہ لاٹ صاحب سے طے کر آئے ھیں راجہ صاحب ھی کی جگہ پر اکتفا کریں گے۔ ساری ریاست میں ھلچل مچ گئی۔ اتفاق سے ریاست کے سول سرجن رخصت پر گئے تھے۔ یہ ان کی جگہ پر تعنیات کر دئے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد سول سرجن صاحب واپس آئے تو انجینیر صاحب پر فالج گرا۔ ان کی جگہ ان کو دے دی گئی۔ آخری بار یہ خبر سنی گئی کہ وہ ریاست کے ھائی کورٹ کے چیف جسٹس ھوگئے تھے اور اپنے ولیعھد کو ریاست کے ولیعھد کا مصاحب بنوا دینے کی فکر میں تھے۔

یہی حالت چارپائی کی ھے فرق صرف یہ ھے کہ ان ملازم صاحب سے کہیں زیادہ مفید ثابت ھوتی ھے! فرض کیجئے آپ بیمار ھیں۔ آخرت کا سامان آپ کے پاس ھو یا نہ ھو اگر چارپائی آپ کے پاس ھے تو پھر دنیا میں آپ کو کسی اور چیز کی حاجت نہیں۔ دوا کی پڑیا تکئے کے نیچے، جوشاندہ کی شیشی سرھانے رکھی ھوئی، بڑی بیوی طبیب تیماردار، چھوٹی بیوی خدمتگذار، چارپائی سے ملا ھوا پاخانہ کا برتن، چارپائی کے نیچے میلے کپڑے، بچوں کے کھلونے جھاڑو، آش جو، روئی کے پھائے، کاغذ کے ٹکڑے، مچھر،

بھنگیے، گھر یا محلہ کے دو ایک بچے جن میں ایک آدھ زکام خسرے میں مبتلا! اچھے ہوگئے تو بیوی نے چارپائی کھڑی کر کے غسل کرا دیا ورنہ آپ کے دشمن اسی چارپائی پر لب گور لائے گئے۔

ہندوستانی گھرانوں میں چارپائی کو ڈرائنگ روم، سونے کا کمرہ، غسلخانہ، پائخانہ، قلعہ، خانقاہ، خیمہ، دوا خانہ، صندوق، کتاب گھر، شفا خانہ سب کی حیثیت کبھی کبھی بہ یک وقت ورنہ وقت وقت پر حاصل ہوتی ہے۔ کوئی مہمان آیا۔ چارپائی نکالی گئی۔ اس پر ایک نئی دری بچھا دی گئی جس کے تہ کے نشان ایسے معلوم ہوں کے جیسے کسی چھوٹی سی آراضی کو مینڈوں اور نالیوں سے بہت سے مالکوں میں بانٹ دیا گیا ہو اور مہمان صاحب معہ اچکن ٹوپی، بیگ بغچی کے بیٹھ گئے۔ اور تھوڑی دیر کے لئے یہ معلوم کرنا دشوار ہوگیا کہ مہمان بیوقوف ہے یا میزبان بدنصیب! چارپائی ہی پر ان کا منھ ہاتھ دھلایا جائے گا۔ اسی چارپائی پر ان کو کھانا کھلایا جائے گا اور اسی چارپائی پر یہ سو رہیں گے۔ سو جانے کے بعد ان پر سے مچھر مکھی اسی طرح اڑائی جائے گی جیسے کوئی پھیری والا اپنے خوانچہ پر سے جھاڑو نما مورچھل سے مکھیاں اڑا رہا ہو۔

چارپائی پر سوکھنے کے لئے اناج پھیلایا جائے گا۔ جس پر تمام دن چڑیاں حملے کرتی دانے چگتی اور گالیاں سنتی رہیں گی۔ کوئی تقریب ہوئی تو بڑے پیمانے پر

چارپائی پر آلو چھیلے جائیں گے۔ سرکاری نوکری میں پنشن
کے قریب ہوتے ہیں تو جو کچھ رخصت جمع ہوئی رہتی
ھے اسکو لے کر ملازم سبکدوش ہوجاتے ہیں۔ اسی
طرح چارپائی پنشن کے قریب پہنچتی ھے تو اس کو کسی
کال کوٹھری میں داخل کر دیتے ہیں۔ اور اس پر سال بھر
کا پیاز کا ذخیرہ جمع کر دیا جاتا ھے۔ ایک دفعہ دیہات کے
ایک میزبان نے پیاز ھٹا کر اس خاکسار کو ایسی ھی ایک
پنشن یافتہ چارپائی پر اسی کال کوٹھری میں آرام فرمانے کی
عزت بخشی تھی اور پیاز کو چارپائی کے نیچے جمع کردیا
گیا تھا۔ اس رات کو مجھ پر آسمان کے اتنے ھی طبق
روشن ہوگئے تھے جتنے ساری پیازوں میں چھلکے تھے
اور وہ یقیناً چودہ سے زیادہ تھے۔

فراق اور وصال، بیماری و تندرستی، تصنیف و تالیف،
سرقہ اور شاعری سب سے چارپائی ھی پر نپٹتے ہیں۔ بچے،
بوڑھے اور مریض اس کو بطور پاخانہ، غسل خانہ کام میں
لاتے ہیں۔ کبھی ادوان کشادہ کر دی گئی، کبھی بنا ہوا
حصہ کاٹ دیا گیا اور کام بن گیا۔ پختہ فرش پر گھسیٹئے
تو معلوم ہو کوئی ملٹری ٹینک مہم پر جا رہا ھے یا بجلی
کا تڑاقا ہو رہا ھے۔ کھٹملوں سے نجات پانے کے لئے جو
ترکیبیں کی جاتی ہیں اور جس جس آسن میں چارپائی نظر
آتی ھے یا جو سلوک اس کے ساتھ روا رکھا جاتا ھے ان
پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستانی بیوی کا تخیل

ہندوستانیوں نے چارپائی ہی سے لیا ہے!

دو چارپائیاں اس طور پر کھڑی کر دیں کہ ان کے پائے آمنے سامنے ہو گئے۔ پھر ان پر ایک کملی یا رضائی ڈال دی۔ کمرہ تیار ہو گیا۔ گھر میں بچوں کو اس طرح کا حجرہ بنانے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ یہاں وہ ان تمام باتوں کی مشق کرتے ہیں جو ماں باپ کو کرتے دیکھتے ہیں۔ ایٹن اور ہیرو انگلستان کے دو مشہور پبلک اسکول ہیں۔ ان کے کھیل کے میدان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ واٹرلو کی تاریخی جنگ یہیں جیتی گئی تھی۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ ہندوستان کی ساری مہم ہم ہندوستانی چارپائی کے اسی گھروندے میں سر کر چکے ہوتے ہیں۔

برسات کی سڑی گرمی پڑ رہی ہو، کسی گھریلو تقریب میں آپ دیکھیں گے کہ محلہ نہیں سارے قصبہ کی عورتیں خواہ وہ کسی سائز، عمر یا مزاج کی ہوں صرف ایک چارپائی پر چاہے وہ کسی سائز، عمر یا مزاج کی ہو رونق افروز ہیں۔ اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہر عورت کی گود میں دو ایک بچے اور زبان پر پانسات کلمات خیر ضرور ہوں گے۔ کتنی زیادہ عورتیں کتنی کم جگہ میں آجاتی ہیں اس کا اندازہ کوئی نہیں کرسکتا جب تک کہ چارپائی کے بعد کسی یکہ اور تانگہ پر ان کے ہجوم کو سفر کرتے نہ دیکھ چکا ہو۔ یہ اللہ کی مصلحت اور ایجاد کرنے والے کی پیش بینی ہے کہ ہانکنے والے اور گھوڑے

دونوں کی پشت سواریوں کی طرف ہوتی ہے اگر کہیں یہ سواریوں کو دیکھتے ہوتے تو یقینا غش کھا کر گر پڑتے۔

چارپائی ایک اچھے بکس کا بھی کام دیتی ہے۔ تکیہ کے نیچے ہر قسم کی گولیاں جن کے استعمال سے آپ کے سوا کوئی اور واقف نہیں ہوتا، ایک آدھ روپیہ، چند دھیلے پیسے، اسٹیشنری، کتابیں رسالے، جاڑے کے کپڑے تھوڑا بہت ناشتا، نقش سلیمانی، فہرست دواخانہ، سمن، جعلی دستاویز کے کچھ مسودے، یہ سب چارپائی میں آباد ملیں گے۔ میں ایک ایسے صاحب سے واقف ہوں جو چارپائی پر لیٹے لیٹے ان میں سے ہر ایک کو، اجالا ہو یا اندھیرا، اس صحت کے ساتھ آنکھ بند کرکے نکال لیتے اور پھر رکھ دیتے جیسے حکیم نابینا صاحب مرحوم اپنے لمبے چوڑے بکس میں سے ہر مرض کی دوائیں نکال لیتے اور پھر رکھ دیتے۔

حکومت بھی چارپائی ہی پر سے ہوتی ہے۔ خاندان کے کرتا دھرتا۔ چارپائی ہی پر براجمان ہوتے ہیں۔ وہیں سے ہر طرح کے احکام جاری ہوتے رہتے ہیں اور ہر گناہگار کو سزا بھی وہیں سے دی جاتی ہے، آلات سزا میں ہاتھ، پاؤں، زبان کے علاوہ ڈنڈا، جوتا، تاملوٹ بھی ہیں جنہیں اکثر پھینک کر مارتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ توقف کرنے میں غصہ کا تاؤ مدھم نہ پڑجائے اور ان آلات کو

مجرم پر استعمال کرنے کے بجائے اپنے اوپر استعمال کرنے کی ضرورت نہ محسوس ہونے لگے۔

چارپائی ہی کھانے کا کمرہ بھی ہوتی ہے۔ باورچی خانہ سے کھانا چلا اور اس کے ساتھ پانسات چھوٹے بڑے بچے، اتنی ہی مرغیاں، دو ایک کتے، بلی اور بےشمار مکھیاں آ پہنچیں، سب اپنے قرینہ سے بیٹھ گئیں۔

صاحب خانہ صدر دستر خوان ہیں۔ ایک بچہ زیادہ کھانے پر مار کھاتا ہے، دوسرا بدتمیزی سے کھانے پر، تیسرا کم کھانے پر، چوتھا نہ کھانے پر اور بقیہ اسپر کہ ان کو مکھیاں کھائے جاتی ہیں۔ دوسری طرف بیوی مکھی اڑاتی جاتی ہے۔ اور شوہر کی بدزبانی سنتی اور بدتمیزی سہتی جاتی ہے۔ کھانا ختم ہوا۔ شوہر شاعر ہوئے تو ہاتھ دھو کر فکر سخن میں چارپائی ہی پر لیٹ گئے۔ کہیں دفتر میں ملازم ہوئے تو اس طرح جان لے کر بھاگے جیسے گھر میں آگ لگی ہے۔ اور کوئی مذہبی آدمی ہوئے تو اللہ کی یاد میں قیلولہ کرنے لگے۔ بیوی بچے بدن دبانے اور بددعائیں سننے لگے۔

کوئی چیز خواہ کسی قسم کی ہو، کہیں گم ہوئی ہو ہندوستانی اس کی تلاش کی ابتدا چارئی سے کرتا ہے۔ اس میں ہاتھی، سوئی، بیوی، بچے، موزے، مرغی، چور کسی کی تخصیص نہیں۔ رات میں کھٹکا ہوا۔ اس نے چارپائی کے نیچے دیکھنا شروع کر دیا۔ کھٹکا اور بڑھا تو خود چارپائی

کے نیچے پناہ لی۔ ھماری زندگی کا شاید ھی کوئی ایسا فعل ھو جس کا ارتکاب چارپائی پر نہ کیا گیا ھو۔

چارپائی ھندوستان کی آب و ھوا، تمدن و معاشرت، ضرورت و ایجاد کا سب سے بھرپور نمونہ ھے۔ ھندوستان اور ھندوستانیوں کے مانند ڈھیلی ڈھالی، شکستہ حال، بے سروسامان۔ لیکن ھندوستانیوں کی طرح غالب اور حکمراں کے لئے ھر قسم کا سامان راحت فراھم کرنے کے لئے آمادہ۔ کوچ اور صوفے کے مریض اور ڈرائنگ روم کے اسیر آس راحت و عافیت کا کیا اندازہ لگا سکتے ھیں جو چارپائی پر میسر آتی ھے! شعراء نے انسان کی خوشی اور خوشحالی کے لئے کچھ باتیں منتخب کرلی ھیں مثلاً سچے دوست، شراب، فراغت، اور گوشۂ چمن۔ ھندوستان جیسے ملک کے لئے سامان کی فہرست اور بھی مختصر ھونی چاھئے۔ میرے نزدیک تو صرف ایک چارپائی ان تمام ضروریات کی بدل ھوسکتی ھے۔

بانوں کی ٹوٹی ھوئی چارپائی ھے جسے مکے کے کھیت میں بطور مچان باندھ دیا گیا ھے۔ ھر طرف لہلہاتے جھومتے ھوئے کھیت ھیں۔ بارش نے گرد و پیش کو تازہ اور شاداب کر دیا ھے۔ دور دور جھیلیں جھمکتی، چھلکتی نظر آتی ھیں۔ جن میں طرح طرح کے آبی جانور اپنی بولیوں سے برسات کی عملداری اور مزیداری کا اعلان کرتے ھیں۔

مچان پر بیٹھا ھوا کسان کھیت کی رکھوالی کررھا ھے

رہا ہے۔ اسکے ہاں نہ آسائش ہے، نہ آرائش، نہ عشق و عاشقی، نہ علم و فضل، نہ دولت و اقتدار۔ لیکن یہ تمام باتیں چارپائی پر بیٹھے ہوئے اسی کسان کی محنت کا کرشمہ ہیں۔ پھر ایک دن آئے گا جب اسکی پیداوار کو چور، مہاجن یا زمیندار لوٹ لیں گے اور اسی چارپائی پر اسکو سانپ ڈس لے گا اور قصہ پاک ہوجائے گا۔

برسات ہی کا موسم ہے۔ گاؤں میں آموں کا باغ، کبھی دھوپ کبھی چھاؤں۔ کوئل کوکتی ہے، ہوا لہکتی ہے۔ گاؤں کے لڑکے لڑکیاں دھوم مچا رہی ہیں۔ کہیں کوئی پکا ہوا آم ڈال سے ٹوٹ کر گرتا ہے۔ سب کے سب جھپٹتے ہیں۔ جس کو مل گیا وہ ہیرو بن گیا۔ جس کو نہ ملا اسپر سب نے ٹھٹھے لگائے۔ یہی لڑکے لڑکیاں جو اس وقت کسی طرح قابل التفات نظر نہیں آتیں کسے معلوم آگے چل کر زمانہ اور زندگی کی کن نیرنگیوں کو آجاگر کریں گے۔ کتنے فاقے کریں گے، کتنے فاتح بنیں گے، کتنے نامور اور نیک نام، کتنے گمنام و نافرجام!

اور یہ خاکسار ایک کھری چارپائی پر اس باغ میں آرام فرما رہا ہے۔ چارپائی باغبان کی ہے۔ باغ کسی اور کا ہے۔ لڑکے لڑکیاں گاؤں کی ہیں۔ میرے حصہ کا صرف آم ہے۔ ایسے میں جو کچھ دماغ میں آئے تھوڑا ہے۔ یا جو تھوڑا دماغ میں ہے وہ بھی نکل جائے تو کیا تعجب! پھر عالم تصور میں ایسی کائنات تعمیر کرنے لگتا

ہوں جو صرف میرے لئے ہے، جو میرے ہی اشارے پر بنتی بگڑتی ہے۔ مجھے خالق کا درجہ حاصل ہے۔ اپنے مخلوق ہونے کا وہم بھی نہیں گذرتا۔ نہ اس کا خیال کہ زمانہ کسے کہتے ہیں نہ اس کی پرواہ کہ زندگی کیا ہے۔ دوسروں کو ان کا اسیر دیکھ کر چونک پڑتا ہوں۔ معاً یہ محسوس کرکے کہ میں ان لوگوں سے اور خود زمانہ اور زندگی سے علاحدہ بھی ہوں ذرا دیر کبھی اونگھ جاتا ہوں۔ ممکن ہے اونگھنے میں پہلے سے مبتلا ہوں!

(مضامین رشید)

کرشن چندر

دو فرلانگ لمبی سڑک

کچہریوں سے لے کر لا کالج تک بس یہی دو فرلانگ لمبی سڑک ہوگی- ہر روز مجھے اسی سڑک پر سے گذرنا ہوتا ہے، کبھی پیدل، کبھی سائیکل پر- سڑک کے دو رویہ شیشم کے سوکھے آداس سے درخت کھڑے ہیں- ان میں نہ حسن ہے، نہ چھانو- سخت کھردرے تنے اور ٹہنیوں پر گدھوں کے جھنڈ- سڑک صاف، سیدھی اور سخت ہے- متواتر نو سال سے میں اس پر چل رہا ہوں- نہ اس میں کبھی کوئی گڑھا دیکھا ہے نہ شگاف- سخت سخت پتھروں کو کوٹ کوٹ کر یہ سڑک تیار کی گئی ہے- اور اب اس پر کول‌تار بھی بچھی ہے جس کی عجیب سی لو' گرمیوں میں طبیعت کو پریشان کر دیتی ہے-

سڑکیں تو میں نے بہت دیکھی بھالی ہیں- لمبی لمبی، چوڑی چوڑی سڑکیں، برادے سے ڈھنپی ہوئی سڑکیں، سڑکیں جن پر سرخ بجری بچھی ہوئی تھی، سڑکیں جن کے گرد سرو و شمشاد کے درخت کھڑے تھے- سڑکیں —— مگر نام گنانے سے کیا فائدہ؟ اس طرح تو ان گنت سڑکیں دیکھی ہوں گی لیکن جتنی اچھی طرح میں اس سڑک کو

جانتا ہوں کسی اپنے گھرے دوست کو بھی اتنی اچھی طرح نہیں جانتا۔ متواتر نو سال سے اسے جانتا ہوں اور ہر صبح اپنے گھر سے جو کچہریوں کے قریب ھی ھے اٹھ کر دفتر جاتا ہوں جو لا کالج کے پاس واقع ھے۔ بس یہی دو فرلانگ کی سڑک! ہر صبح اور شام کچہریوں سے لے کر کالج کے آخری دروازے تک، کبھی سائیکل پر کبھی پیدل۔

اس کا رنگ کبھی نہیں بدلتا۔ اس کی ذہنیت میں تبدیلی نہیں آتی۔ اس کی صورت میں روکھاپن بہ دستور موجود ھے، جیسے کہہ رھی ہو، مجھے کسی کی کیا پرواہ ھے! اور ھے بھی سچ۔ اسے کسی کی پرواہ کیوں ہو؟ سیکڑوں ہزاروں انسان، گھوڑے گاڑیاں، موٹریں اس پر سے ہر روز گذر جاتی ھیں اور پیچھے کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ اس کی ہلکی نیلی اور سانولی سطح اسی طرح سخت اور سنگلاخ ھے جیسی پہلے روز تھی جب ایک یوریشن ٹھیکے دار نے اسے بنایا تھا۔

یہ کیا سوچتی ھے؟ یا شاید سوچتی ھی نہیں۔ میرے سامنے ھی ان نو سالوں میں اس نے کیا کیا واقعات، حادثے دیکھے۔ ہر روز ہر لمحہ کیا نئے تماشے نہیں دیکھتی؟ لیکن کسی نے اسے مسکراتے نہیں دیکھا، نہ روتے ھی، اس کی پتھریلی چھاتی میں کبھی ایک دَرز بھی پیدا ہوئی۔

«ھائے بابا! اندھے، محتاج، غریب فقیر پر ترس کر جاؤ۔ ارے بابا! اے بابو! خدا کے لئے ایک پیسہ دیتے جاؤ۔

ارے بابا! ارے کوئی بھگوان کا پیارا نہیں؟ صاحب جی! میرے ننھے ننھے بچے بلک رہے ہیں! ارے کوئی تو ترس کھاؤ ان یتیموں پر!»

بیسیوں گداگر اسی سڑک کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی اندھا ہے تو کوئی لنجا۔ کسی کی ٹانگ پر ایک خطرناک زخم ہے تو کوئی غریب عورت دو تین چھوٹے چھوٹے بچے گود میں لئے حسرت بھری نگاہوں سے راہ گیروں کی طرف دیکھتی جاتی ہے۔ کوئی پیسا دے دیتا ہے، کوئی تیوری چڑھائے گذر جاتا ہے۔ کوئی گالیاں دے رہا ہے، مسٹنڈے، کام نہیں کرتے، بھیک مانگتے ہیں!

کام! بے کاری! بھیک!

دو لڑکے سائیکل پر سوار ہنستے ہوئے جا رہے ہیں۔ ایک بوڑھا امیر آدمی اپنی شاندار فٹن میں بیٹھا اپنی انگلیوں سے مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہے۔ ایک سست مضمحل کتا فٹن کے پہیوں تلے آگیا ہے۔ اس کی پسلی کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ لہو بہہ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کی افسردی، بے چارگی اس کی ہلکی ہلکی دردناک ٹیاؤں ٹیاؤں کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرسکتی۔

پھر کبھی سڑک سنسان ہوتی ہے۔ صرف ایک جگہ شیشم کی چھدری چھاؤں میں ایک تانگے والا گھوڑے کو سستا رہا ہے۔ گدھ دھوپ میں ٹہنیوں پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ پولیس کا سپاہی آتا ہے۔ ایک زور کی سیٹی، «او تانگے

والے یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے؟ کیا نام ہے تیرا؟ کر دوں چالان؟» «ھجور»! «ھجور کا بچہ! چل تھانے» «ھجور» «یہ تھوڑا ہے۔ اچھا جا تجھے معاف کیا۔»

شام کے دھندلکے میں بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے۔

قمقموں کی زرد زرد روشنی سڑک پر پڑ رہی ہے۔

دو عورتیں، ایک بوڑھی، ایک جوان آپلوں کے ٹوکرے اٹھائے خچروں کی طرح ہانپتی ہوئی گذر رہی ہیں۔ جوان عورت کی چال تیز ہے۔

«بیٹی ذرا ٹھہر تو!» بوڑھی عورت کے چہرے پر بے شمار جھریاں ہیں۔ اس کی چال مدھم ہے اس کے لہجے میں بے کسی ہے۔

«بیٹی، میں، ذرا ٹھہر، میں تھک گئی۔۔ میرے اللہ!»

«اماں ابھی گھر جا کر روٹی پکانی ہے۔ تو تو باؤلی ہوئی ہے۔»

«اچھا بیٹی! اچھا بیٹی!»

بوڑھی عورت جوان عورت کے پیچھے بھاگتی ہوئی جا رہی ہے۔ بوجھ کے مارے اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں، اس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔

وہ سالوں سے اسی سڑک پر چل رہی ہے، اپلوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے۔ کوئی اس کا بوجھ ہلکا نہیں کرتا کوئی اسے ایک لمحہ سستانے نہیں دیتا۔ وہ بھاگی ہوئی جا رہی ہے۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس کے پاؤں

ڈگمگا رہے ہیں۔ اس کی جھریوں میں غم ہے اور بھوک اور فکر اور غلامی اور صدیوں کی غلامی!

آج سڑک پر سرخ حلوان بچھا ہے۔ آر پار جھنڈیاں لگی ہوئی ہیں۔ جا بجا پولیس کے سپاہی کھڑے ہیں۔ کسی بڑے آدمی کی آمد ہے! جبھی تو اسکولوں کے چھوٹے چھوٹے لڑکے نیلی پگڑیاں باندھے سڑک پر دو رویہ قطاروں میں کھڑے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں ہیں۔ ان کے لبوں پر پپڑیاں جم گئی ہیں۔ ان کے چہرے دھوپ کی حدت سے تمتما اٹھے ہیں۔ اسی طرح کھڑے کھڑے وہ ڈیڑھ گھنٹہ سے بڑے آدمی کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب وہ پہلے پہل یہاں سڑک پر کھڑے ہوئے تھے تو ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ اب سب چپ ہیں۔ چند لڑکے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے تھے۔ اب استاد انہیں کان پکڑ کر اٹھا رہے ہیں۔ شفیع کی پگڑی کھل گئی تھی! استاد گھور کر کہہ رہا ہے۔ «او شفی پگڑی ٹھیک کر» پیارے لال کی شلوار اس کے پاؤں میں اٹک گئی ہے اور ازار بند جوتیوں تک لٹک رہا ہے۔ «تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے پیارے لال!»

«ماسٹر جی، پانی!»

«پانی کہاں سے لاؤں؟ یہ بھی تم نے اپنا گھر سمجھ رکھا ہے؟ دو تین منٹ انتظار کرو۔ بس ابھی چھٹی ہوا چاہتی ہے۔»

دو منٹ! تین منٹ! آدھ گھنٹہ!

«ماسٹر جی، پانی!»

«ماسٹر جی، پانی!»

«ماسٹر جی بڑی پیاس لگی ہے!»

لیکن استاد اب اس طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ وہ ادھر ادھر دوڑتے پھرتے ہیں۔ لڑکو ہوشیار ہوجاؤ! دیکھو جھنڈیاں اس طرح ہلانا! ابے تیری جھنڈی کہاں ہے؟ قطار سے باہر ہوجاؤ! بدمعاش کہیں کا! سواری آرہی ہے!

موٹر سائیکلوں کی پھٹ پھٹ بینڈ کا شور پتلی اور چھوٹی جھنڈیاں بے دلی سے ہلتی ہوئی، سوکھے ہوئے گلوں سے پژمردہ نعرے!

بڑا آدمی سڑک سے گذر گیا۔ لڑکوں کی جان میں جان آگئی ہے۔ اب وہ اچھل اچھل کر جھنڈیاں توڑ رہے ہیں، شور مچا رہے ہیں۔

خوانچے والوں کی صدائیں، ریوڑیاں! گرم گرم چنے! حلوا پوری نان کباب!

صبح کی ہلکی ہلکی روشنی میں بھنگی سڑک پر جھاڑو دے رہا ہے۔ اس کے منہ اور ناک پر کپڑا بندھا ہے جیسے بیلوں کے منہ۔ پر جب وہ کولہو چلاتے ہیں۔ وہ گرد و غبار میں اٹا ہوا ہے اور جھاڑو دئے جا رہا ہے۔

میونسپلٹی کا پانی والا چھکڑا آہستہ آہستہ سڑک پر چھڑکاؤ کر رہا ہے۔ چھکڑے کے آگے جتے ہوئے دو بیلوں

کی گردنوں پر زخم پیدا ہوگئے ہیں۔ چھکڑے والا سردی سے ٹھٹھرتا ہوا کوئی گیت گانے کی کوشش کررہا ہے۔ بیلوں کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ابھی سڑک کا کتنا حصہ باقی ہے۔

سڑک کے کنارے ایک بوڑھا گدا گر مرا پڑا ہے۔ اس کے میلے دانت ہونٹوں کے اندر دھنس گئے ہیں۔ اس کی کھلی ہوئی بےنور آنکھیں آسمان کی طرف تک رہی ہیں۔

«خدا کے لئے مجھ غریب پر ترس کرجاؤ رے بابا!»

کوئی کسی پر ترس نہیں کرتا۔ سڑک خاموش اور سنسان ہے۔ یہ سب کچھ دیکھتی ہے، سنتی ہے مگر ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ انسان کے دل کی طرح بے رحم، بےحس اور وحشی ہے!

سڑک خاموش ہے اور سنسان! بلند ٹہنیوں پر گدھ بیٹھے اونگھ رہے ہیں!

یہ دو فرلانگ لمبی سڑک!

(نظارے)

کنھیالال کپور

گھر یاد آیا!

بمبئی پہنچ کر بھی یقین نہ آیا تھا کہ ہم بمبئی پہنچ گئے ہیں، کیونکہ عرف عام میں جسے بمبئی کہتے ہیں وہ در اصل ایک نہیں بلکہ کئی بمبئیوں پر مشتمل ہے۔ مثلاً ایک بمبئی تو وہ ہے جسے «اندھیری» کہتے ہیں (خدا کا شکر اندھیر نگری نہیں کہتے ہیں) اور جسے صرف اس رعایت سے بمبئی کہا جا سکتا ہے جس رعایت سے کسی جراح کو سرجن یا غازی آباد کو دھلی کہا جاسکتا ہے ایک بمبئی «بوری ولی» ہے جہاں کروڑوں مچھروں، پسوؤں اور مکھیوں نے ہزاروں غریب مزدوروں اور کلرکوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ ایک بمبئی «چنچپوکلی» ہے جو بادی النظر میں واقعی «انارکلی» کی خالہ زاد بہن معلوم ہوتی ہے۔ لیکن انارکلی سے اتنی ہی مختلف ہے جتنی ایک عام اونڈی انارکلی سے تھی۔ ایک بمبئی «باندرا» ہے جسے دیکھنے کے بعد بمبئی کارپوریشن کے وجود کا منکر ہونا پڑتا ہے۔ ایک بمبئی «دادر» ہے جسے دیکھے بغیر شاید غالب نے کہا تھا،

«بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر»

ان چھوٹی بڑی بمبئیوں کی بھول بھلیاں میں بیچاری

اصلی بمبئی اس طرح گم ہو کر رہ گئی ہے۔ جیسے دور از کار استعارے میں مفہوم عنقا ہو کر رہ جائے۔ سو میں سے اسی آدمی تو اس کی زیارت سے محروم رہتے ہیں اور باقی بیس جب اس کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو انہیں یہ جان کر سخت مایوسی ہوتی ہے کہ اس کا نام بمبئی نہیں بلکہ بقول میرا جی «ممبئی» ہے کیونکہ جس دیوی کے نام پر شہر آباد ہوا تھا۔ اس کا نام «ممبا دیوی» تھا۔

بمبئی ہندوستان میں واحد شہر ہے جہاں کوئی شخص کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ اگر آپ لکھپتی ہیں تو ہماری بلا سے! بمبئی میں کون لکھپتی نہیں۔ اگر آپ بھوک سے مر رہے ہیں تو شوق سے مرئے۔ موت آپ کا پیدائشی حق ہے۔ بہر حال یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ ہم دخل دینے والے کون؟ اگر آپ راستے سے بھٹک گئے ہیں تو سارا دن گلیوں اور بازاروں کے چکر کاٹئے۔ راہ گیروں کو اتنی فرصت نہیں کہ آپ کی رہنمائی کر سکیں۔ اگر آپ حاجتمند ہیں تو کسی دوسرے شہر میں تشریف لے جائیے۔ بمبئی والے کہتے ہیں «کس کی حاجت روا کرے کوئی!» اس شہر میں کوئی خوبی ہے تو یہ ہے کہ یہاں آپ کی ان لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے جنہیں آپ مدت سے «مرحوم و مغفور» سمجھے بیٹھے تھے۔ آپ کے وہ ہم جماعت جو کالج سے بھاگ گئے تھے، وہ واقف کار جن کے متعلق آپ نے سنا

تھا کہ انھوں نے خودکشی کرلی اور آپ کے وہ رشتہ دار جو آپ کو ایک آنکھ۔ نہیں بھاتے بمبئی کے کسی قہوہ خانے میں آپ سے ضرور ملیں کے اور اگر موقع محل مناسب ہوا تو آپ سے کسی اصلی یا فرضی قرض کا مطالبہ بھی کریں گے۔

اہل بمبئی کے ویسے تو ہزاروں خصوصیات ہیں، لیکن سب سے نمایاں ان کی سنجیدگی اور خاموشی ہے۔ قریب قریب ہر شخص سڑک پر چلتے ہوئے اس قدر زبوں حال نظر آتا ہے گویا ابھی ابھی جنازے کو کندھا دے کر آرہا ہے۔ اور بعض کی آشفتہ حالی کا تو یہ عالم ہے کہ بے اختیار «انا للہ وانا الیہ راجعون» پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ خدا جانے یہ سمندر کی قربت کا اثر ہے یا نس نس میں رچی ہوئی تاجرانہ ذہنیت کا۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ اہل بمبئی کے گھر کی رونق «نغمہ شادی» کے بجائے نوحہ غم پر موقوف ہے۔ ایک مہینے کے قیام میں میں نے صرف ایک شخص کو قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے دیکھا۔ یہ شخص پاگل تھا۔

جس طرح لکھنؤ میں ہر شخص «نواب»، دہلی میں مغل یا پٹھان اور کلکتے میں «دادا» ہوتا ہے اسی طرح بمبئی میں ہر شخص سیٹھ ہوتا ہے۔ نادار پان فروش سے کروڑ پتی پارسی بابا تک ہر آدمی سیٹھ کہلاتا ہے۔ بمبئی میں ہزاروں سیٹھ ایسے بھی ہیں جو رات کو سڑکوں کی پٹریوں پر سوتے ہیں اور بیمار ہونے کے بعد خیراتی شفاخانوں میں

مرتے ہیں۔ بمبئی کے سیٹھوں کی پہچان یہ ہے کہ انگلی میں ایک آدھ انگوٹھی ضرور ہوتی ہے امارت کا دوسرا امتیازی نشان آٹھ منزلہ عمارت کی مالکیت ہے۔ بمبئی کے سیٹھ عموماً عمارتیں کرائے پر دینے کے لئے بناتے ہیں اور غیر واجبی کرائے وصول کرنے کے بعد ہر سال عمارتوں کی تعداد میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ ہر عمارت پر متعدد سیڑھیاں ہوتی ہیں جن کی تعداد کا یہ عالم ہوتا ہے کہ آٹھویں منزل تک پہنچتے پہنچتے صبح سے شام اور شام سے صبح ہوجاتی ہے۔

اہل بمبئی فنون لطیفہ کے دلدادہ ہیں خاص کر موسیقی پر تو جان چھڑکتے ہیں۔ عوام و خواص کا رجحان پکے گانے کی طرف ہے۔ چنانچہ اس گئے گذرے زمانے میں بھی بمبئی میں ایسے اہل کمال موجود ہیں، جو اگرچہ پہروں گاتے ہیں لیکن یہ راز کھلنے نہیں دیتے کہ وہ کیا گا رہے ہیں۔ بمبئی والے انھیں نہایت شوق اور انہماک سے سنتے ہیں۔ گانے والا چاہے گاتے گاتے اکتا جائے، سامعین ڈٹ کر بیٹھے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ محفل رقص وسرود۔ ایک دفعہ گرم ہونے کے بعد سرد ہونے کا نام نہیں لیتی ہے۔ حتی کہ اہل بمبئی کی قوت استقلال پر انسان کو رشک آنے لگتا ہے۔

بمبئی میں عجیب و غریب اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں مثلاً ایک اصطلاح «پگڑی» ہے بظاہر یہ بے ضرر سی ہے۔ لیکن خدا نخواستہ اگر اس کا بھنڈا پھوٹ جائے تو

بات دار و رسن تک جا پہنچتی ھے۔ اس شہر میں آپ پگڑی دئے بغیر کوئی مکان کرائے پر لے ھی نہیں سکتے۔ پگڑی اس ناچیز ھدیہ کا نام ھے جو ایک ضرورتمند آدمی مکان خالی کرنے والے شخص کی خدمت میں بصد عجز و نیاز پیش کرتا ھے۔ پگڑی دو ھزار سے دس ھزار تک ھو سکتی ھے اور مکان «مالا بار ھل» پر یا «میرین ڈرائیو» پر واقع ھو تو اتنی ھو سکتی ھے کہ آپ اس رقم سے کسی دوسرے شہر میں اچھی خاصی کوٹھی خرید سکتے ھیں۔ ایک اور اصطلاح «بھیل پوری» ھے جو در اصل چاٹ کی مترادف ھے۔ بھیل پوری میں لال مرچ اور گرم مصالحہ اس مقدار میں ملایا جاتا ھے کہ کھانے والا دھلی کی «نہاری» یاد کر اٹھتا ھے۔ بایں ھمہ اس چیز کی مقبولیت کا یہ حال ھے کہ بمبئی میں بھنی ھوئی مونگ پھلی کے بعد سب سے زیادہ کھپت اسی کی ھے۔

در اصل بمبئی ایک شہر نہیں بلکہ ایک بہت بڑا مقناطیس ھے جو ان دنوں ھندوستان کے اھل فن کی کشش کا باعث بنا ھوا ھے۔

بمبئی واقعی عجیب شہر ھے۔ سر بفلک عمارتیں، پٹریوں پر سوئی ھوئی مخلوق، کپڑے کے شاندار کارخانے، ننگ دھڑنگ مزدور، میلوں تک پھیلا ھوا سمندر، غسلخانوں میں بند پانی کے نل، انسانوں کا عظیم اجتماع، قبرستان کی سی بوجھل اور گہری افسردگی، اور بسا اوقات یوں محسوس ھونے لگتا ھے جیسے انسان جنت کی روش پر ٹہلتے ٹہلتے یک لخت جہنم میں

پہنچ جائے۔ ایک ایسا جہنم جہاں ہر سرمایہ دار نے سیم و زر کے عوض اپنی روح کو ابلیس کے سپرد کر دیا ہے اور جس کے شعلے اس تیزی اور تندی سے بھڑک رہے ہیں کہ دوزخ پر چراغاں کا گمان ہوتا ہے۔

(نوک نشتر)

حصّهٔ نظم

میر حسن

داستان تولد ہونے شاہزادہ بے نظیر کی

خوشی سے پلا مجھ کو ساقی شراب!
کوئی دن میں بجتا ہے چنگ و رباب
کروں نغمۂ تہنیت کو شروع
کہ اک نیک اختر کرے ہے طلوع
عجب صاحب حسن پیدا ہوا!
جسے مہر و مہ دیکھ شیدا ہوا!
نظر کو نہ ہو حسن پر اس کے تاب!
اسے دیکھ بے تاب ہو آفتاب!
ہوا وہ جو اس شکل سے دل پذیر
رکھا نام اس کا شہ بے نظیر
نئے سر سے عالم کو عشرت ہوئی
کہ لڑکے کے ہونے کی نوبت ہوئی
محل سے لگا تا بہ دیوان عام
عجب طرح کا اک ہوا ازدحام

چلے لے کے نذریں امیر و وزیر
لگے کھینچنے زر کے تودے فقیر
کیا بھانڈ اور بھگتیوں نے ہجوم
ہوئی آہے آہے مبارک کی دھوم
جہاں تک کہ سازندے تھے ساز کے
دھنی دست کے اور آواز کے
جہاں تک کہ تھے گایت اور رھتکار
لگے گانے اور ناچنے ایک بار
لگے بجنے قانون و بین و رباب
بہا ہر طرف جوئے عشرت کا آب
ستاروں کے پردے بنا کر درست
سجانے لگے سب وہ چالاک و چست
گئی باتیں کی آسماں تک کمک
اٹھا گنبد چرخ سارا دھمک
خوشی کی زبس ہر طرف تھی بساط
لگے ناچنے اس پہ اہل نشاط
چھٹی تک غرض تھی خوشی ہی کی بات
کہ دن عید اور رات تھی شب برات
بڑھے ابر ہی ابر میں جوں ہلال
محل میں لگا پلنے وہ نو نہال
برس گانٹھ جس سال اسکی ہوئی
دل پسنگاں کی گرہ کھل گئی

وہ گل جبکہ چوتھے برس میں لگا
بڑھایا گیا دودھ اس ماہ کا
ہوئی تھی جو کچھ پہلے شادی کی دھوم
اسی طرح سے پھر ہوا واں ہجوم
وہ گل پانو سے اپنے جس جا چلا
وہاں آنکھ کو نرگسوں نے ملا
لگا پھرنے وہ سرو جب پانو پانو
کئے بردے آزاد تب اس کے نانو

(سحرالبیان)

پہنچنا بکاؤلی کا دارالخلافت زین الملوک میں
اور
وزیر ہوکر تاج الملوک کی تلاش میں رہنا

گلچیں کا جو اب پتا ملا ہے - یوں شاخ قلم سے گل کھلا ہے
وہ باد چمن خراماں - یعنی وہ بکاؤلی پریشاں
گلشن سے جو خاک اڑاتی آئی - اس شہر میں آتے آتے آئی
دیکھا تو خوشی کے چہچہے تھے - گلچیں کے شگوفے کھل رہے تھے
گلبانگ زناں تھا جو جہاں تھا - ایک ایک ہزار داستاں تھا
پاتے ہی پتا خوشی سے پھولی - شاد ایسی ہوئی کہ رنج بھولی
جادو سے بنی وہ آدمی زاد - انسانوں میں آ ملی پریزاد
سلطان کی سواری آرہی تھی - صورت جو نگاہ کی، پری تھی
پوچھا اے آدم پری رو - انساں ہے، پری ہے، کون ہے تو؟
کیا نام ہے اور وطن کدھر ہے - ہے کون سا گل چمن کدھر ہے؟
دی اس نے دعا کہا بصد سوز - فرخ ہوں شہائیں ابن فیروز
گل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں - غربت زدہ کیا وطن بتاؤں
گھر بار سے کیا فقیر کو کام - کیا لیجئے چھوڑے گاؤں کا نام
پوچھا کہ سبب، کہا کہ قسمت - پوچھا کہ طلب، کہا قناعت
باتوں پہ فدا ہوا شہنشاہ - لایا بصد امتیاز ہمراہ

چہرے سے امیر زادہ پایا ۔ گھر لا کے وزیر اسے بنایا
نذریں لئے بندگان درگاہ ۔ دستور سے آملے بصد جاہ
دربار میں چاروں شاہزادے ۔ دیکھے تو کھلے وہ دل کے سادے
چاہا گلچیں کا امتحان لے ۔ پوچھا کہ نگیں جو لے کہاں لے
بتلانے لگے وہ چاروں نادان ۔ کوئی یمن اور کوئی بدخشان
جانا کہ جو گل یہ لائے ہوتے ۔ خاتم کے نگیں بتائے ہوتے
تجویز میں تھا یہ صاحب فکر ۔ آیا تاج الملوک کا ذکر
ظاہر نہ کیا بطون اپنا ۔ طالع سے لیا شگون اپنا
منزل گہ رہرواں بنا کے ۔ شام و سحر اس میں آپ آ کے
رہرو کو دیا بلطف و اکرام ۔ آتے آرام جاتے پیغام

(گلزار نسیم)

مسدس

انیس

حضرت امام حسین کا رجز

اعدا کی زبانوں پہ یہ حیرت کی تھی تقریر
حضرت یہ رجز پڑھتے تھے تولے ہوئے شمشیر
دیکھو نہ مٹاؤ مجھے اے فرقۂ بے پیر
میں یوسف کنعان رسالت کی ہوں تصویر
واللہ تعلی نہیں یہ کلمۂ حق ہے
عالم کے مرقع میں حسین ایک ورق ہے

واللہ جہاں میں مرا ہمسر نہیں کوئی
محتاج ہوں پر مجھ سا تونگر نہیں کوئی
ہاں میرے سوا شافع محشر نہیں کوئی
یوں سب ہیں مگر سبط پیمبر نہیں کوئی
باطل ہے اگر دعویٰ اعجاز کریگا
کس بات پہ دنیا میں کوئی ناز کریگا

ہم وہ ہیں کہ اللہ نے کوثر ہمیں بخشا
سرداری فردوس کا افسر ہمیں بخشا
اقبال علی خلق پیمبر ہمیں بخشا
قدرت ہمیں دی زور ہمیں، زر ہمیں بخشا

ہم نور ہیں گھر طور تجلا ہے ہمارا
تخت بن داؤد مصلاّ ہے ہمارا
نانا وہ کہ ہیں جنکے قدم عرش کے سر تاج
قوسین مکان ختم رسل صاحب معراج
ماں ایسی کہ سب جس کی شفاعت کے ہیں محتاج
باپ ایسا صنم خانوں کو جس نے کیا تاراج
لڑنے کو اگر حیدر صفدر نہ نکلتے
بت گھر سے خدا کے کبھی باہر نہ نکلتے
کس جنگ میں سینہ کو سپر کرکے نہ آئے
کس مرحلۂ صعب کو سر کرکے نہ آئے
کس فوج کے صف زیر و زبر کرکے نہ آئے
تھی کونسی شب جس کو سحر کرکے نہ آئے
تھا کون جو ایمان تہ صمصام نہ لایا
اس شخص کا سر لائے جو اسلام نہ لایا
اصنام نہ کچھ کم تھے نہ کفار تھے تھوڑے
طاقت تھی کہ عزیٰ کو کوئی لات سے توڑے
بدکیشوں نے سجدے بھی کئے ہاتھ بھی جوڑے
بے توڑے وہ بت حیدر صفدر نے نہ چھوڑے
کعبہ کو صفا کر دیا خالق کے کرم سے
نکلے اسد اللہ اذاں دیکے حرم سے
اس عہد میں مالک اسی تلوار کے ہم ہیں
جرار پسر حیدر کرار کے ہم ہیں

فرزند محمد سے جہاں دار کے ہم ہیں
وارث شہ لولاک کی سرکار کے ہم ہیں
کچھ غیر کفن ساتھ نہیں لیکے گئے ہیں
تابوت سکینہ بھی ہمیں دے کے گئے ہیں

یہ فرق پہ عمامہ سردار زمن ہے
یہ تیغ علی ہے یہ مگر بند حسن ہے
یہ جوشن داؤد ہے جو حافظ تن ہے
یہ پیرہن یوسف کنعان محن ہے
دکھلائیں سند دست رسول عربی کی
یہ مہر سلیمان ہے یہ خاتم ہے نبی کی

دیکھو تو یہ ہے کون سے جرار کی تلوار
کس شیر کے قبضہ میں ہے کرار کی تلوار
دریا نے بھی دیکھی نہیں اس دھار کی تلوار
بجلی کی تو یہ بجلی ہے تلوار کی تلوار
قہر و غضب اللہ کا ہے کاٹ نہیں ہے
کہتے ہیں اسے موت کا گھر گھاٹ نہیں ہے

دم لے کہیں رک کر وہ روانی نہیں اسمیں
چلنے میں سبک تر ہے گرانی نہیں اسمیں
جز حرف ظفر اور نشانی نہیں اسمیں
جل جاؤ کے سب آگ ہے پانی نہیں اسمیں
چھوڑے گی نہ زندہ اسے جو دشمن دیں ہے
تابین نہیں غصے سے اجل چیں بجبیں ہے

سب قطرے ہیں گر فیض کے دریا ہیں تو ہم ہیں
ہر نقطۂ قرآن کے شناسا ہیں تو ہم ہیں
حق جسکا ہے جامع ذخیرہ ہیں تو ہم ہیں
افضل ہیں تو ہم عالم و دانا ہیں تو ہم ہیں
تعلیم ملک عرش پہ تھا ورد ہمارا
جبریل سا استاد ہے شاگرد ہمارا
گر فیض ظہور شہ لولاک نہ ہوتا
بالائے زمیں گنبد افلاک نہ ہوتا
کچھ خاک کے طبقے میں بجز خاک نہ ہوتا
ہم پاک نہ کرتے تو جہاں پاک نہ ہوتا
یہ شور اذاں کا سحر و شام کہاں تھا
ہم عرش پہ جب تھے تو یہ اسلام کہاں تھا
(مراثی میر انیس جلد اول)

حالی

مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے

بشر کو ہے لازم کہ ہمت نہ ہارے
جہاں تک ہو کام آپ اپنے سنوارے
خدا کے سوا چھوڑ دے سب سہارے
کہ ہیں عارضی زور، کمزور سارے
آڑے وقت تم دائیں بائیں نہ جھانکو
سدا اپنی گاڑی کو گر آپ ہانکو
بہت خوان بے اشتہا تم نے کھائے
بہت بوجھ بندھ بندھ کے تم نے اٹھائے
بہت آس پر ساز کی راگ گائے
بہت عارضی تم نے جلوے دکھائے
بس اب اپنی گردن پہ رکھو جوا تم
کرو حاجتیں آپ اپنی روا تم
تمھیں اپنی مشکل کو آسان کروگے
تمھیں درد کا اپنی درماں کروگے
تمھیں اپنی منزل کا ساماں کروگے
کروگے تمہیں کچھ اگر یاں کروگے
چھپا دست ہمت میں زور قضا ہے
مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے

گیا اب وہ دل تنگیوں کا زمانا
که اپنوں کا حصه تھا پڑھنا پڑھانا
برھمن کا پھنسے اگر شدر یانا
تو اس پر نہیں کوئی لب تازیانا
ہوئے برطرف سب نشیب و فراز اب
سفید و سیاہ میں نہیں امتیاز اب

بس اب وقت کا حکم ناطق یہی ھے
که جو کچھ ھے دنیا میں تعلیم ھی ھے
یہی آج کل اصل ترماندھی ھے
اسی میں چھپا سر شاھنشہی ھے
ملی ھے یہ طاقت اسی کیمیا کو
که کرتی ھے یہ ایک شاہ و گدا کو

سکھاتی ھے محکوم کو یہ اطاعت
سجھاتی ھے حاکم کو راہ عدالت
دلوں سے مٹاتی ھے نقش عداوت
جہاں سے اٹھاتی ھے رسم بغاوت
بس اب اپنی گردن پہ رکھو جوا تم
کرو حاجتیں آپ اپنی روا تم

(مسدس حالی، ضمیمه)

پنڈت برج موہن کیفی

طلوعِ سحر

تھا دور ایک منزل ابھی لشکر سحر
سرہنگ شب نے بھانپ کے دنیا کو دی خبر
شبنم کے قاصد آئے غباروں میں بیٹھ کر
ان سے صبا نے سُن کے خبر کی وہ مشتہر
سرگوشیاں تھیں غنچوں میں ہرکس کا انتظار
جو رایت شفق ہوا مشرق سے آشکار
چپکے سے کیا نسیم سحر نے سنا دیا
غنچوں کے دل کو فرط طرب سے کھلا دیا
باد سحر نے معجزہ اپنا دکھا دیا
شبنم کے چھینٹے دے کے چمن کو جگا دیا
غنچے بھی کھل کھلا کے گلستاں میں ہنس پڑے
انگڑائی لے کے سرو بھی جیسے ہوئے کھڑے
رنگ شفق سے تھا جو افق فلک زر نگار
یک مشت گل نے کیسۂ زر کردیا نثار
دلکش عروسِ باغ کا تھا حسن اور نکھار
صدقہ ہزار جان سے ہے عندلیب زار
منہ شاہدانِ گل جو شبنم نے دھوئے تھے
سنبل کے بال بال میں موتی پروئے تھے

چھایا ہوا تھا دھر میں اک نور کا سماں
دھویا ہوا تھا آبِ رخِ حور سے جہاں
انجم کا آسماں سے کھسکا تھا کارواں
مہتاب کے بھی منھ پہ آڑی تھیں ہوائیاں
شب زندہ دار چرخ کا بھی رنگ فق ہوا
غالب ھر ایک رنگ پہ رنگ شفق ہوا
نکلا جو خیمہ سے شہ گیتی ستان صبح
حاضر ہوئے سلام کو درباریان صبح
فوجِ شعاع لے کے بڑھا قہرمان صبح
لہرا رہا تھا پیل فلک پر نشان صبح
ڈنکا ہوا طیور چمن کی صفیر کا
اک غل تھا آمد شہ گردوں سریر کا
فوجِ شعاع کی ہوئی آمد کی جب یہ دھوم
تو ہوگیا فلک سے ہوا لشکر نجوم
مشرق میں یوں ہوا شہ خاور کا جب قدوم
آنکھوں پہ رکھے سب نے قدم اس کے چوم چوم
اک دم میں شب کی تیرگی کافور ہوگئی
دنیا چمک کے اک کرۂ نور ہوگئی
(واردات)

برج نرائن چکبست

رامائن کا ایک سین

(راجہ رام چندر کا ماں سے رخصت ہونا)

رخصت ہوا وہ باپ سے لیکر خدا کا نام
راہ وفا کی منزل اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام
دامن سے اشک پوچھ کے دل سے کیا کلام
اظہار بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتا سا ہوگیا ہے یہ ہے شدت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ
نور نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ
لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالت دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زبان کی طرح بولنے لگا

آخر اسیرِ یاس کا قفل دہن کھلا
افسانۂ شدائد رنج و محن کھلا
اک دفترِ مظالمِ چرخِ کہن کھلا
وا تھا دہان زخم کہ باب سخن کھلا

درد دل غریب جو صرف بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا
روکر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں!
میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں
لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں

کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیجدوں!
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں!
دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سپید!
اندھا کئے ہوئے ہے زر و مال کی امید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید
سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثال بید

لکھی ہے کیا حیات ابداں کے واسطے؟
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے؟
لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم
ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم
تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم

میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت وتاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو
کن کن ریاضتوں سے گذارے ہیں ماہ و سال
دیکھی تمھاری شکل جب اے میرے نونہال!
پورا ہوا جو بیاہ کا ارمان تھا کمال
آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال
چھٹتی ہوں ان سے جوگ لیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے!
ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر
گھر جن کے بے چراغ رہے آہ! عمر بھر
رہتا مرا بھی نخل تمنا جو بے ثمر
یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغ تمنا اجڑ گیا
سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ
منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ
اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ
تقصیر میری خالقِ عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے
سن کر زباں سے ماں کی فریاد درد خیز
اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز

عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز
لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز
سوچا یہی کہ جان سے بےکس گذر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے
پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور
مایوس کیوں ہیں آپ؟ الم کا ہے کیوں وفور؟
صدمہ یہ شاق عالم پیری میں ہے ضرور
لیکن نہ دل سے کیجئے صبر و قرار دور
شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی
یہ جعل، یہ فریب، یہ سازش، یہ شور وشر
ہونا جو ہے سب اس کے بہانے ہیں سر بسر
اسباب ظاہری ہیں نہ ان پر کرو نظر
کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر
خاص اس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اسے ہے کوئی جانتا نہیں
راحت ہو یا کہ رنج، خوشی ہو کہ انتشار
واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکر کردگار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگ روزگار
ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اٹھائی کڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پر مصیبت پڑی نہیں

دیکھے ہیں اس سے بڑھ کے زمانے نے انقلاب
جن سے کہ بے گناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
سوز دروں سے قلب و جگر ہو گئے کباب
پیری مٹی کسی کی، کسی کا مٹا شباب
کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اجڑ گئے

ماں باپ منہ ہی دیکھتے تھے جن کا ہر گھڑی
قائم تھیں جن کے دم سے امیدیں بڑی بڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اُڑ کر نہیں پڑی
ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی
محروم جب وہ گل ہوئے رنگ حیات سے
ان کو جلا کے خاک کیا اپنے ہات سے

کہتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال
ان بے کسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
ہے کبریا کی شان، گذرتے ہی ماہ و سال
خود دل سے درد ہجر کا مٹتا گیا خیال
ہاں کچھ دنوں تو نوحۂ و ماتم ہوا کیا
آخر کو رو کے بیٹھ رہے اور کیا کیا؟

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار
کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انسان گناہگار
یہ جانتے نہیں، وہ دانائے روزگار

انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امر رضا میں جو خم رہے
اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام
بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام
قائم امید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں
اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں
ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم انہیں گراں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں
وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائگاں
رکھتے ہیں جو عزیز انہیں اپنی جان کی طرح
ملتے ہیں دست یاس وہ برگ خزاں کی طرح
لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بے شمار
موقوف کچھ ریاض پہ ان کی نہیں بہار
دیکھو یہ قدرت چمن آرائے روزگار
وہ ابر و باد و برف میں رہتے ہیں برقرار
ہوتا ہے ان پہ فضل جو ربِ کریم کا
موجِ سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا
اپنی نگاہ ہے کرم کارساز پر
صحرا چمن بنے گا، وہ ہے مہرباں اگر

جنگل ہو یا پہاڑ، سفر ہو کہ ہو حضر
رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بےخبر
اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

(صبحِ وطن!)

قصیدہ

ذوق

در مدح ابوظفر بہادر شاہ مرحوم

ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی
کرتا ہے ھلال ابروے پرخم سے اشارہ
ساقی کو کہ بھر بادہ سے کشتیِ طلائی
ہے عکس فگن جام بلوریں سے مئے سرخ
کس رنگ سے ہوں ھاتھ نہ میکش کے حنائی
کوندے ہے جو بجلی تو یہ سوجھے ہے نشہ میں
ساقی نے ہے آتش سے مے تیز آڑائی
یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے
ہووے نہ ممیز کرۂ ناری و مائی
پہنچا کمک لشکر باراں سے ہے یہ زور
ہر نالہ کی ہے دشت میں دریا پہ چڑھائی
ہو قلزم عماں پہ لب جو متبسم
تالاب سمندر کو کرے چشم نمائی
ہے کثرت باراں سے ہوئی عام یہ سردی
کافور کی تاثیر گئی جو زمیں پائی

سردی حنا پہنچے ہے عاشق کے جگر میں
معشوق کا گر ہاتھ میں ہے دست حنائی

عالم یہ ہوا کا ہے کہ تاثیر ہوا سے
گردوں پہ ہے خورشید کا بھی دیدہ ہوائی

کیا صرف ہوا ہے طرب و عیش کا عالم
ہے مدرسہ میں بھی سبق صرف ہوائی

خالی نہیں ہے مے سے روش دانۂ انگور
زاہد کا بھی ہر دانہ تسبیح ریائی

جو آئینۂ دل ہے وہ عاشق کی بغل میں
گویا کہ ہے مینا سے مے کاہ ربائی

کرتی ہے صبا آکے کبھی مشک فشانی
کرتی ہے نسیم آکے کبھی لخلخہ سائی

تھا سوزنی خار کا صحرا میں جہاں فرش
سبزہ نے وہاں مخمل خوش رنگ بچھائی

آرائش گلشن کے لئے جامۂ رنگین
زیبائش غنچہ کے لئے تنگ قبائی

ہے نرگس شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل
برگ گل سوسن نے دھڑی لب پہ جمائی

ابرو پہ کرے قوس قزح وسمہ تو خورشید
سرخی شفق سے کرے ریش اپنی حنائی

رخسارۂ گلچیں کا ہے سرخی سے یہ عالم
جوں وقت غضب چہرۂ ترکان خطائی

کیا ساغر رنگیں کو کیا جلد مہیا
نرگس نے تو سرسوں ھی ھتیلی پہ جمائی
ہوئی متحمل نہیں اک ساغر گل کی
شاخ گل احمر کی نزاکت سے کلائی
اعجاز نوا سنجی مطرب سے چمن میں
ہر خار کی ھے نوک زباں شعر نوائی
حیرت کی نہیں جائے کہ دیوار چمن پر
ہر طائر تصویر کرے نغمہ سرائی
شاھا ترے جلوہ سے ھے یہ عید کو رونق
عالم نے تجھے دیکھ کے ھے عید منائی
کہتے ھیں مہ نو جسے ابرو نے وہ تیری
کی آئینۂ چرخ میں ھے عکس نمائی
پرتو سے ترے جام مے عیش سر بزم
لے ساغر جمشید کرے کارروائی
ٹپکے لب ساغر سے وہ قطرہ کروی شکل
ہو مثل فلک جس میں تماشائی خدائی
کیا علم سمائے ترے سینہ میں فلک کے
دریا کی کہاں ہوسکے کاسہ میں سمائی
پڑھتا ھوں ترے سامنے وہ مطلع موزوں
احسنت کہیں سن کے بہائی و سنائی
یوں کرسی زر پر ھے تری جلوہ نمائی
جس طرح کہ مصحف ہو سر رحل طلائی

رکھتا ھے تو وہ دست سخا سامنے جسکے
ھے بحر بھی کشتی بکف از بہر گدائی
گمرہ کو ھدایت جو تری راہ پہ لاوے
رہزن بھی اگر ہو تو کرے راہ نمائی
تا ناخن شمشیر نہ ہو ناخن تدبیر
دشمن کی ترے ہو نہ کبھی عقدہ کشائی
خورشید سے افزوں ہو نشاں سجدہ کا روشن
گر چرخ کرے در کی ترے ناصیہ سائی
عکس رخ روشن سے ترے جوں ید بیضا
کرتا ھے کف آئینہ اعجاز نمائی
کرتا ھے تیری نذر سدا نقد سعادت
ھے مشتری چرخ کی کیا نیک کمائی
اک مرغ ھوا کیا ھے کہ سیمرغ نہ چھوڑے
گر سر بھوا ھووے ترا تیر ھوائی
ھر کوہ اگر کوہ صفا ہو تو عجب کیا
ہو فیض رساں جب ترے باطن کی صفائی
ہو بلکہ صفا ایسی دل سنگ صنم میں
ھر بت میں کرے صورت خالق جلوہ نمائی
ھر شعر غزل میں ترے معنی شفا ھیں
قربان غزل کے تری دیوان شفائی
مانع جو ہوا دست درازی کو ترا عدل
پروانہ کو بھی شمع نے انگلی نہ لگائی

زنجیر میں جوھر کے رھی تیغ ھمیشہ
خونریز کو ھو عہد میں تیرے نہ رھائی

دیتا ھے دعا ذوق کہ مضمون ثنا میں
ھے ذھن رسا کو یہ کہاں اس کی رسائی

ھر سال شہا ھووے مبارک یہ تجھے عید
تو مسند شاھی پہ کرے جلوہ نمائی

(قصائد ذوق)

مراثی

انیس

مرثیۂ علی اکبر

جب دولت سرور پہ زوال آ گیا رن میں
جس گل پہ تصدق تھے وہ مرجھا گیا رن میں
آنکھوں کا جو تھا نور وہ کھویا گیا رن میں
جینے کا جو باعث تھا وہ مارا گیا رن میں
ماں باپ کو سہرا بھی نہ اکبر نے دکھایا
پیری میں عجب داغ مقدر نے دکھایا

کس دکھ میں فلک نے علی اکبر کو چھڑایا
بے مہر نے کس ماہ سے اختر کو چھڑایا
قمری سے عجب سرو سمن بر کو چھڑایا
کس فصل میں بلبل سے گل تر کو جھڑایا
یوں دم بھی کسی تازہ جواں نے نہیں توڑا
یوں پھول کو بھی باد خزاں نے نہیں توڑا

یوں ماں باپ کی قسمت کو الٹتے نہیں دیکھا
اس طرح مقدر کو پلٹتے نہیں دیکھا
یوں بڑھ کے کسی سرو کو گھٹتے نہیں دیکھا
اس عمر کا پودا کوئی کٹتے نہیں دیکھا

نازوں کے دعاؤں کے مرادوں کے پلے تھے
وا حسرت و دروا ابھی پھولے نہ پھلے تھے
بھیگیں جو مسیں ماں نے کیا سجدۂ باری
یعنی مرے گلشن میں چلی باد بہاری
سبزہ ہوا آغاز تو فرمایا کہ واری
صد شکر کہ سر سبز ہوئی کشت ہماری
شادی تھی کہ اب گھر مین دلھن لانے کے دن ہیں
اس کی نہ خبر تھی کہ خزاں آنے کے دن ہیں
گیسو ابھی منت کے بڑھائے نہ تھے ماں نے
جو کوچ کیا خلق سے اس تازہ جواں نے
آئینہ بنایا جسے رب دوجہاں نے
اس سینے کو زخمی کیا دشمن کی سناں نے
توڑا نہیں ایسا گل شاداب کسی نے
کھولا کئے منھ اور نہ دیا آب کسی نے
افسوس نہ کچھ عمر نے اکبر سے وفا کی
پورے وہ جواں بھی نہ ہوئے تھے کہ قضا کی
کیا دخل ہے بندے کو مشیت میں خدا کی
ماں کہتی تھی مجھ سے علی اکبر نے دغا کی
کچھ بس نہ چلا آگئے یوں موت کے بس میں
پیدا ہوئے اور مر گئے اٹھارہ برس میں
ھوتا ہے برابر کا پسر قوت بازو
آرام جگر راحت جاں زینت پہلو

ایسا پسر ماہ لقا صفدر و خوش رو
مرجائے تو کیا دل پہ رہے باپ کے قابو
گر پڑتے ہیں اٹھ اٹھ کے یہ کمزور ہیں شبیر
جیتے ہیں مگر غم سے لب گور میں شبیر
اٹھتی ہے کبھی دل میں کبھی ہوک جگر میں
ہے درد کبھی سینے میں اور گاہ کمر میں
رن میں کبھی جاتے ہیں کبھی آتے ہیں گھر میں
ہے دن کا اجالا پہ اندھیرا ہے نظر میں
غل کرتے ہیں اعدا پہ سنائی نہیں دیتا
لاشہ یہ علی اکبر کا دکھائی نہیں دیتا
یہ درد جگر ہے کہ سنبھلنے نہیں دیتا
یہ زور نقاہت ہے کہ چلنے نہیں دیتا
غم اور طرف دل کو بہلنے نہیں دیتا
رعشہ کف افسوس بھی ملنے نہیں دیتا
غم کون سا خرمن کے لئے برق نہیں ہے
پر صبر کی طاقت میں ذرا فرق نہیں ہے
آتی ہے صدا دل سے کہ طاقت نہیں مجھ میں
کہتا ہے جگر ضعف ہے قوت نہیں مجھ میں
ہر چشم ہے گریاں کہ بصارت نہیں مجھ میں
کہتی ہے کمر درد سے حالت نہیں مجھ میں
بے مہری افلاک نے دل توڑ دیا ہے
شبیر کو سب ساتھیوں نے چھوڑ دیا ہے

پیری میں یہ اندوہ ضعیفی میں یہ دکھ درد
صدمے سے رخ پاک ہے کیسر کی طرح زرد
چہرہ جو مکدر ہے تو زلفیں بھی ہیں پرگرد
تن کانپنے لگتا ہے جو بھرتے ہیں دم سرد
جس پھول کے عاشق تھے وہ گلشن میں نہیں ہے
یہ حال ہے گویا کہ لہو تن میں نہیں ہے
دل کا ہے تقاضا کہ تڑپنے کی رضا دو
کہتا ہے جگر خون مرا آنکھوں سے بہا دو
سر کھینچتا ہے نالوں نے کہ گردوں کو ہلا دو
شہ کہتے ہیں یاد اب علی اکبر کی بھلادو
مختار کا جو حکم ہے کچھ جبر نہیں ہے
اس زخم کا مرہم کوئی جز صبر نہیں ہے
جو اہل محبت ہیں بلا ان کے لئے ہے
صابر ہیں یہ درد دوا ان کے لئے ہے
مظلوم جو ہیں لطف خدا ان کے لئے ہے
ہر رنج میں اک تازہ مزا ان کے لئے ہے
سو دکھ ہوں تو ہوں محو ہیں الفت میں اسی کی
روتے ہیں تو روتے ہیں محبت میں اسی کی
اکبر تھا تو وہ کیا تھا اگر ہم ہیں تو کیا ہیں
سو ایسے جو بندے ہوں تو خالق پہ فدا ہیں
کچھ غم نہیں گر ہم سے جدا ہیں تو جدا ہیں
یہ کس کی عنایت ہے کہ راضی برضا ہیں

غم تھا جو سر اس راہ مین فرزند نہ دیتا
کیا کرتے اگر وہ ہمیں دل بند نہ دیتا
فدیہ ہوا فرزند جواں شکر کی جا ہے
خوشنود ہے رب دوجہاں شکر کی جا ہے
لب پر نہیں فریاد و فغاں شکر کی جا ہے
گردن سے گیا بار گراں شکر کی جا ہے
جو ہم کو عطا کی تھی وہ دولت اسے پہنچی
فارغ ہوئے ہم اس کی امانت اسے پہنچی
اٹھارہ برس تک جو رہا پاس وہ دلدار
تھی یہ بھی عنایت کہ وہ ہے راحم و غفار
ہر حال میں بندے کو اطاعت ہے سزاوار
مجبور ہیں ہم اور وہ ہے قادر و مختار
اکبر سا جواں رشک قمر کس نے دیا تھا
وہ صبر بھی بخشے گا پسر جس نے دیا ہے
جینے کا یقیں رحلت عباس مین کب تھا
مرجانا برادر کا قیامت تھا غضب تھا
اللہ پہ روشن ہے جو کچھ دل پہ تعب تھا
تڑپے نہیں یہ کس کی عنایت کا سبب تھا
بہتر تھا ہمارے لئے تنہائی کا مرنا
سب سہل ہے جب دیکھ چکے بھائی کا مرنا
داخل ہوئی خیل شہدا میں مری اولاد
جو نیک کمائی ہے وہ ہوتی نہیں برباد

سب اس پہ فدا ھیں علی اکبر ہوں کہ سجاد
بندہ وہ ھے صاحب کی جو بھولے نہ کبھی یاد
طاعت تو ھے دشوار اطاعت تو نجانئے
بیٹا تو کیا صبر کی دولت تو نجانئے
رونے سے ملیں گر علی اکبر تو میں روؤں
چھاتی سے لپٹ جائے وہ دلبر تو میں روؤں
آباد جو ہو آجڑا ھوا گھر تو میں روؤں
رونے سے یہ دولت ہو میسر تو میں روؤں
پھر کھوئے ہوئے لال کو پاتے نہیں دیکھا
دنیا سے گیا جو آسے آتے نہیں دیکھا
روئے جو مصیبت میں تو کیا ہوتا ھے اے دل
ہوتا ھے جو قسمت کا لکھا ہوتا ھے اے دل
ھر درد کا آلفت میں مزا ہوتا ھے اے دل
صابر سے رضا مند خدا ہوتا ھے اے دل
مطلب ترے یہ مرحلے طے کر کے ملیں گے
جیتے ھین تو فرزند سے اب مر کے ملیں گے

(مراثی انیس، جلد دوم)

مرثیہ عارف

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہ شب چاردھم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور
تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گذری نہ بہر حال یہ مدت خوش ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور
نادان ہو جو کہتے ہو کہ جیتے کیوں ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

(دیوان غالب)

بربادی خانمان شبلی

وہ برادر کہ مرا یوسف کنعانی تھا
وہ کہ مجموعۂ ہر خوبی انسانی تھا
وہ کہ گھر بھر کے لئے رحمت یزدانی تھا
قوت دست و دل شبلی نعمانی تھا
جوش اسی کا تھا جو میرے سر پرشور میں تھا
بل اسی کا یہ مرے خامۂ پرزور میں تھا
ہم سے ناکاروں کی اک قوت کامل تھا وہی
مایۂ عزت اجداد کا حامل تھا وہی
مسند والد مرحوم کے قابل تھا وہی
یوں تو سب اور بھی اعضا ہیں مگر دل تھا وہی
اب وہ مجموعۂ اخلاق! کہاں سے لاؤں
ہائے افسوس میں اسحاق کہاں سے لاؤں!
اس کا صدقہ تھا کہ ہر طرح سے تھا میں بے غم
گھر کے جھگڑوں سے نہ کچھ فکر نہ رنج والم
امن وراحت کے جو سامان تھے ہر طرح بہم
میں تھا اور مشغلۂ نامہ قرطاس و قلم
اس کے صدقے سے تھی میری سخن آرائی بھی
اس کا ممنون تھا مرا گوشۂ تنہائی بھی

تازہ تھا مرے دل پہ مہدیؔ مرحوم کا داغ
کہ مرا قوت بازو تھا، مرا چشم و چراغ
اس کو جنت میں جو خالق نے دیا گنج فراغ
میں یہ کہتا تھا کہ اب بھی ترو تازہ ہے یہ داغ
یعنی وہ آئینہ خوبئ اخلاق تو ہے
اٹھ گیا مہدئ مرحوم تو اسحاق تو ہے
آج افسوس کہ وہ نیر تاباں بھی گیا
میری جمیعت خاطر کا وہ ساماں بھی گیا
اب وہ شیرازۂ اوراق پریشاں بھی گیا
عتبۂ والد مرحوم کا درباں بھی گیا
گلۂ خوبئ تقدیر رہا جاتا ہے
نوجواں جاتے ہیں اور پیر رہا جاتا ہے
آہ بھائی ترے مرنے کے تھے یہ بھی کوئی دن
وہ ترا اوج شباب اور وہ بچے کم سن
مسند حلقۂ احباب ہے سونی تجھ بن
تو ہی تھا اب خلف صدر نشینان مسن
دن جب آئے کہ تجھے رہبر جمہور کہوں
چرخ اب مجھ سے یہ کہتا ہے کہ مغفور کہوں
یہ بھی اے جان برادر کوئی جانے کا ہے طور
اپنے بچوں کی نہ کچھ فکر نہ تدبیر نہ غور
ابھی آنے بھی نہ پایا تھا ترے اوج کا دور
کیا ہوا تجھ کو کہ تو ہو گیا کچھ اور سے اور

چھوڑ کر بچوں کو بے صبر و سکوں جاتا ہے
کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے
آہ اے مرگ کسی شے کی نہیں تجھکو تمیز
تیری نظروں میں برابر ہے گہر اور پشیز
میں نے مانا ترے نزدیک نہ تھا وہ کوئی چیز
رحم کرنا تھا کہ چھوڑے ہیں کئی اسنے عزیز
لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں
اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں
اے خدا شبلیؒ دل خستہ بایں موے سفید
لے کے آیا ہے ترے درگہ عالی میں امید
مرنے والوں کو نجات ابدی کی ہو نوید
خوش و خرم رہے چھوٹا یہ مرا بھائی جنید
لکھوں قصۂ غم تاب رقم بھی تو نہیں
اب مرے خانۂ پر زور میں دم بھی تو نہیں

(کلیات شبلی)

قطعات

سودا

دور خزاں

باغ دلی میں جو اک روز ہوا میرا گذر
نہ وہ گل ھی نظر آیا نہ وہ گلشن نہ بہار
نخل بے بار پڑے، سوکھی پڑی ھیں روشیں
خاک اڑتی ھے ہر اک طرف پڑے ھیں خس و خار
مسکراتا تھا جہاں غنچہ و گل ھنستا تھا
اشک شبنم کے بھی قطرے کے نہیں واں آثار
جس جگہ جلوہ نما رہتے تھے سرو و شمشاد
مشت پر قمری کے اس جا نظر آئے اک بار
دیکھتا کیا ہوں مگر سوکھی سی اک شاخ اوپر
عندلیب ایک ھے، بے بال و پر و دل افگار
بہ دم سرد و بصد حسرت و صد سوز جگر
دیکھ کر سوئے چمن کہتی ھے با نالہ و زار
حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

(کلیات سودا)

حالی

شعر کی طرف خطاب

اے شعر! دل فریب نہ ہو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر اگر ہے راستی کا تیری ذات میں
تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو
تو نے کیا ہے بحر حقیقت کو موج خیز
دھوکے کا غرق کر کے رہے گا جہاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمان شاعری
قبلہ ہو اب ادھر تو نہ کیجو نماز تو
چپ چاپ اپنے سچ سے کئے جا دلوں میں گھر
اونچا ابھی نہ کر علم امتیاز تو
جو نابلد ہیں ان کو بتا چور بن کے راہ
گر چاہتا ہے خضر کی عمر دراز تو
عزت کا بھید ملک کی خدمت مین ہے چھپا
محمود جان آپ کو گر ہے ایاز تو
اے شعر! راہ راست پہ تو جب کہ پڑ گیا
اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو

کرنی ہے فتح گر نئی دنیا تو لے نکل
بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو

ہوتی ہے سچ کی قدر، پہ بے قدریوں کے بعد
اس کے خلاف ہو تو سمجھ اس کو شاذ تر

جو قدرداں ہو اپنا اسے مغتنم سمجھ
حالی کو تجھ پہ ناز ہے کر اس پہ ناز تو

(دیوان حالی)

منظومات

حالی

مناجات بیوہ

اے عزت اور عظمت والے - رحمت اور عدالت والے
دکھڑا تجھ سے یہ کہنا دل کا - اک بشریت کا ھے تقاضا
جب کوئی دکھ یاد آجاتا ھے - جی بے ساختہ بھر جاتا ھے
ورنہ ھے اس دنیا میں دھرا کیا - خواب کا سا اک ھے یہ تماشا
دکھ سے ھے یہاں کے گھبرانا کیا - سکھ پہ یہاں کے اترانا کیا
عیش کی یہاں مہلت ھے نہ غم کی - سب یہ نمائش ھے کوئی دم کی
آنی جانی چیز ھیں خوشیاں - چلتی پھرتی چھانو ھیں ارمان
ریت کی سی دیوار ھے دنیا - اوچھے کا سا پیار ھے دنیا
بجلی جیسی چمک ھے اس کی - پل دو پل کی جھمک ھے اس کی
آج ھے یہاں جنگل میں منگل - کل سنسان پڑا ھے جنگل
آج ھے پانا کل ھے کھونا - آج ھے ھنسنا کل ھے رونا
خوشی میں غم یہاں ملا ھوا ھے - امرت میں بس گھلا ھوا ھے
سیر کو جو اس باغ میں آئیں - دیکھ کے پھل کو ھاتھ لگائیں
خوش نہ ھوں خوشیونکے متوالے - ھیں یہ نشے اترنے والے
جو آئے ھیں ان کو ھے جانا - جو گئے ان کو پھر نہیں آنا
تیرے سوا یہاں اے مرے مولا - کوئی رھا ھے اور نہ رھے گا
تھا نہ کچھ آگے تیرے سوا یہاں - اور رھیگا کچھ نہ سدا یہاں

یہاں کوئی دن دکھ پایا ہو کیا - اور کوئی دم سکھ پایا تو کیا
اب نہ مجھے کچھ رنج کی پروا - اور نہ آسائش کی تمنا
چاہتی ہوں اک تیری محبت - اور نہیں رکھتی کوئی حاجت
گھونٹ اک ایسا مجھ کو پلا دے - تیرے سوا جو سب کو بھلا دے
آئے کسی کا دھیان نہ جی میں - کوئی رہے ارمان نہ جی میں
فکر ہو اچھی کی نہ بری کی - تیرے سوا دھن ہو نہ کسی کی
اٹھ نہیں سکتے مجھ سے اب یکدم - یہ دنیا کے ناشدنی غم
دل میں لگن بس اپنی لگا دے - سارے غم اپنے غم میں کھپا دے
دل نہ پھرے دنیا میں بھٹکتا - کوئی رہے نہ کانٹا کھٹکتا
تو ہی ہو دل میں تو ہی زباں پر - مار کے جاؤں لات جہاں پر

پاؤں تجھے اک اک کو گنوا کر
خاک میں جاؤں سب کو ملا کر

(مناجات بیوہ)

اکبر

جدید معاشرت

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہد وفا بھول گئے

پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی
کیک کو چکھ کے سوئیوں کا مزا بھول گئے

بھولے ماں باپ کو اغیار کے چرچوں میں وہاں
سایۂ کفر پڑا نور خدا بھول گئے

کیسے کیسے دل نازک کو دکھایا تم نے
خبر فیصلۂ روز جزا بھول گئے

بخل ہے اہل وطن سے جو وفا میں تم کو
کیا بزرگوں کی وہ سب جود وعطا بھول گئے

نقل مغرب کی ترنگ آئی تمہارے دل میں
اور یہ نکتہ کہ مری اصل ہے کیا بھول گئے

کیا تعجب ہے جو لڑکوں نے بھلایا گھر کو
جب کہ بوڑھے روشن دین خدا بھول گئے

(کلیات اکبر)

شبلی

عدل جہانگیری

قصر شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گذر
ایک دن نورجہاں بام پہ تھی جلوہ فگن
کوئی شامت زدہ رہ گیر، آدھر آ نکلا
گرچہ تھی قصر مین ہر چار طرف سے قدغن
غیرت حسن سے بیگم نے طپنچہ مارا
خاک پر ڈھیر تھا اک کشتۂ بےگور و کفن
ساتھ ہی شاہ جہاں گیر کو پہنچی جو خبر
غیظ سے آ گئی ابروئے عدالت پہ شکن
حکم بھیجا کہ کنیزان شبستان شہی
جاکے پوچھ آئیں کہ سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن؟
نخوت حسن سے بیگم نے بصد ناز کہا
میری جانب سے کرو عرض بہ آئین حسن
ہاں مجھے واقعہ قتل سے انکار نہیں
مجھ سے ناموس حیا نے یہ کہا تھا کہ «بزن»
اس کی گستاخ نگاہی نے کیا اس کو ہلاک
کشور حسن میں جاری ہے یہی شرع کہن

مفتئ دیں سے جہاں گیر نے فتویٰ پوچھا
کہ شریعت میں کسی کو نہیں کچھ جائے سخن

مفتیٔ دین نے بے خوف و خطر صاف کہا
شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن
لوگ دربار میں اس حکم سے تھرا اٹھے
پر جہانگیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن
ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جاکر
پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر و رسن
پھر اسی طرح اسے کھینچ کے باہر لائیں
اور جلاد کو دیں حکم کہ «ھاں تیغ بزن»
یہ وہی نور جہاں ہے کہ حقیقت میں یہی
تھی جہانگیر کے پردے میں شہنشاہ زمن
اس کی پیشانی نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جاکے بن جاتی تھی اوراق حکومت پہ شکن
اب وہی پاؤں ہر اک گام پہ تھراتے ہیں
جن کی چال سے پامال تھے مرغان چمن
ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع!
ایک بے کس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن!

خدمت شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام
خون بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امرحسن
مفتی شرع سے پھر شاہ نے فتوا پوچھا
بولے جائز ہے رضامند ہوں، گر بچہ و زن
وارثوں کو جو دئے لاکھ درم بیگم نے
سب نے دربار میں کی عرض کہ اے شاہ زمن

ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص
قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن

ہوچکا جب کہ شہنشاہ کو پورا یہ یقیں
کہ نہیں اس میں کوئی شائبۂ حیلہ و فن
اٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوئے حرم
تھی جہاں نورجہاں معتکف بیت حزن
دفعۃً پانو پہ بیگم کے گرا اور یہ کہا
«تو اگر کشتہ شدی آہ! چہ می کردم من؟»

(کلیات شبلی)

ظفر علی خاں

ایک رشی کے داغ جگر کی کہانی راجہ جسرتھ کی زبانی

(۱)

ابر تھا چھایا ہوا اور فصل تھی برسات کی
تھی زمیں پہنے ہوئے وردی ہری بانات کی
آفتاب اوڑھے ہوئے تھا چادر ابر سیاہ
برق کی چشمک زنی سے خیرہ ہوتی تھی نگاہ
بادل اتنے میں در ناسفتہ برسانے لگا
داستان قلزم و عمان کو دھرانے لگا
جھوم کر اٹھی گھٹا، برسی برس کر چھٹ گئی
گرد کی چادر زمین کے منھ سے فوراً ہٹ گئی
بادلوں سے نور خورشید اس طرف چھننے لگا
سائبان قوس قزح کا اس طرف تننے لگا
سبزہ زاروں میں کلیلیں کرتے پھرتے تھے ہرن
تھا مہابن کا ہر اک کونہ ختن اندوختن
جنگلوں میں مست ہوکر ناچتے پھرتے تھے مور
کوہساروں میں چکوروں نے مچا رکھا تھا شور
ڈھل کے پہنچا تھا افق کی آستاں تک آفتاب
تھا شفق کا اس کے منھ پر ایک نارنجی نقاب

(۲)

بینش آرا یہ مناظر تھے کچھ ایسے دلفریب
ہاتھ سے جاتا رہا دل میرے اور دل سے شکیب
عالم از خود رفتگی کا مجھ پہ طاری ہو گیا
جوش مستی کا مری رگ رگ میں ساری ہو گیا
جی میں آیا میرے رہ رہ کر بڑی بے اختیار
گھر سے نکلوں، جا کے جنگل میں کروں سیر و شکار
ہاتھ میں ترکش لئے کاندھے پہ اٹکائے کماں
میں چلا بن کی طرف گھر سے نکل کر شادماں
پڑ رہی تھی ہر طرف میری تجسس کی نظر
تاک میں تھا میں کہ شاید کوئی پیاسا جانور
گھاٹ پر جاتا ہو پیاس اپنی بجھانے کے لئے
اور بنے آماج گہ میرے نشانے کے لئے
دفعۃً ندی سے قلقل کی ہوئی پیدا صدا
اور میرا تیر اس صدا کی سمت مخفی میں چلا
گرچہ اٹکل سے چلایا میں نے تھا اس تیر کو
لیکن اس کی زد میں لے آئی قضا نخچیر کو
آہ سینے سے کسی کے ایک نکلی دردناک
میرے دامان جگر کے ہو گئے سو جس سے چاک

(۳)

تھا یہاں کوئی رشی دنیا سے منھ موڑے ہوئے
اس نمود بے بقا کی بیڑیاں توڑے ہوئے

اس کا بیٹا تھا جسے پالا تھا اس نے ناز سے
جو ہوا گھائل مرے تیر غلط انداز سے

نیم بسمل ہو کے ندی میں یہ لڑکا گر پڑا
درد کی اور کرب کی حالت میں یوں کہنے لگا

ہائے زخموں سے کیا ہے مجھ کو کس نے چور چور
یہ سزا ہے جس کی ایسا کیا ہوا مجھ سے قصور

ہے مرا بےچارہ باپ اک راہب خلوت نشیں
جس نے ایذا آج کے دن تک کسی کو دی نہیں

پانی بھرنے کے لئے آیا تھا میں اس گھاٹ پر
بھر کے ٹھلیا جل سے اٹھا تھا کہ جلدی جاؤں گھر

کیا خبر تھی مجھ کو موت آ کر کھڑی ہے تاک میں
آنکھوں آنکھوں میں ملا جائے گی مجھ کو خاک میں

کچھ نہیں ہے رنج اپنی زندگانی کا مجھے
فکر ہے باپ اور ماں کی ناتوانی کا مجھے

ضعف کا یہ غلبہ ہے اُن سے ہلا جاتا نہیں
اُن کو آنکھوں سے نظر افسوس کچھ آتا نہیں

ہائے اُن کی پھوٹی آنکھوں کا ستارہ میں ہی تھا
اُن بچاروں کے بڑھاپے کا سہارا میں ہی تھا

زندگی ان کے لئے کیونکر نہ اب جنجال ہو
میرے بعد اُن کا خدا جانے کیسا حال ہو

ایک مجھ کو ہی نہیں آ کر لگا ہے تیر یہ
بلکہ اُن دونوں کا پہلو بھی گیا ہے چیر یہ

جب سنیں میں نے یہ باتیں جاں فراش و دل فگار
ہوش میرے اڑ گئے سیماب سے جیسے قرار
میرے مذہب میں نہیں جائز کہ دوں لوگوں کو دکھ
ہے یہ راجہ کے لئے لازم کہ دے پرجا کو سکھ
بات یہ ممکن تھی پھر کیونکر کہ مجھ سے برملا
ہو کسی کی اور وہ بھی اک رشی کی ہتیا
بید لرزاں کی طرح ڈر سے لگا میں کانپنے
میں یہ سمجھتا تھا مجھے گویا ڈسا ہے سانپ نے
ہاتھ سے میرے گرے تیر و کماں بے اختیار
جس طرح پتوں سے ہو خالی خزاں میں شاخسار
ڈگمگاتا لڑکھڑاتا میں گیا آخر وہاں
کر رہا تھا نالہ وشیون مرا بسمل جہاں
دیکھتا کیا ہوں کہ اک لڑکا نہایت ہی حسیں
شان قدرت کی تماشاگاہ تھی جس کی جبیں
حسن کا جس کے یہ عالم تھا کہ ماہ آسماں
دیکھ لیتا گر اسے غیرت سے ہو جاتا نہاں
سسکیاں لیتا ہوا زخمی پڑا ہے خاک پر
حسرت و اندوہ سے لبریز ہے اس کی نظر
جس میں پانی تھا بھرا اس نے وہ مٹی کا گھڑا
اک طرف ٹوٹا ہوا تھا پاس ہی اس کے پڑا

سیں نے دیکھا اس کو اور اس نے نظر بھر کر مجھے
روح کانپ اٹھی مری کہتے سنا یوں جب اسے
میں نے اے راجہ بتا تو کی تھی کیا تیری خطا
ھائے تونے کس لئے سینہ مرا چھلنی کیا
کس لئے ڈھایا ھے اس بیکس پہ یوں تونے ستم
اک رشی کے گھر میں ہو آکر لیا جس نے جنم
باپ کے بیٹے کے اور ماں کے جگر تقدیر سے
چھد گئے اک ساتھ اے راجہ ترے اک تیر سے
میری ماں اور باپ کو اس وقت میرا انتظار
کر رھا ھوگا وھاں بے چین بے کل بے قرار
دیر سے پیاسے تھے وہ شدت کی ھوگی ان کو پیاس
بندھ رھی دونوں کو ھوگی میرے گھر آنے کی آس
جلد جا بپتا سنا میری یہ میرے باپ کو
اور بچا اس کے غضب سے راجہ اپنے آپ کو
کیونکہ اے راجہ سراپ اس نے اگر تجھکو دیا
یاد رکھ پل بھر میں تو جل کر بھسم ھو جائے گا
لیکن اوّل میرے سینے سے جدا یہ تیر کر
درد سے مجھ کو بچانے کی کوئی تدبیر کر
تاکہ جاں پر الم نکلے ذرا آرام سے
اور نہ ھوں میں شرمسار اس مرگ بے ھنگام سے

اس قدر کہتے ہی لڑکے کی نظر پتھرا گئی
اس کے منہ پہ مردنی اور مجھ پہ حسرت چھا گئی
کھینچتے ہی تیر تن سے جان رخصت ہوگئی
روح اس کی گود میں پرماتما کے سو گئی
مجھ سے نادانستہ سرزد ہوچکا تھا جو گناہ
تھا خیال اس کا وہ دریا جس کی ملتی تھی نہ تھاہ
دل میں درد و کرب کا چشمہ ابلتا تھا مرے
کوئی چٹکی سے کلیجے کو مسلتا تھا مرے
سرنگوں ہوکر کھڑا تھا میں سراہانے لاش کے
دل میں کہتا تھا مجھے یہ تیر لگتا کاش کے
سوچتا تھا میں مرا کفارۂ عصیاں ہو گیا
نذر ہے جس کی جگر اس درد کا درماں ہو گیا
جھونپڑے کے پاس پہنچا تو مجھے آیا نظر
باپ ماں لڑکے کے بیٹھے ہیں زمین کے فرش پر
دونوں کے دونوں ہیں نابینا و پیر و ناتواں
نور آنکھوں میں نہیں لیکن ہے چہروں پر عیاں
باغ میں گویا کہ ہیں دو طائر بے بال و پر
چھوڑ رکھا ہے جنہیں صیاد نے پر کاٹ کر
رہ گئے تھے اب تن تنہا یہ دونوں تیرہ بخت
آسماں تھا دور ان سے اور زمیں تھی ان پہ سخت

ایک لنگر تھا سو مجھ سے وہ گیا تھا ٹوٹ ابھی
ساتھ بیٹے کا بچاروں سے گیا تھا چھوٹ ابھی
کر رہے تھے اپنے بیٹے کا وہ دونوں انتظار
آرہا تھا یاد وہ اس وقت ان کو بار بار

(۷)

دے دیا دھوکا انہیں میرے قدم کی چانپ نے
کی ملامت اس طرح لخت جگر کو باپ نے
جان بابا! تو نے دیر اتنی لگائی کس لئے
پیاس جلد آکر نہیں میری بجھائی کس لئے
کھیل میں تو نے گنوایا وقت گھر کے کام کا
کچھ خیال آیا نہ ماں اور باپ کے آرام کا
جلد جلد اٹھتے نہیں کس واسطے تیرے قدم
بھاگ کر آ اپنی چھاتی سے لگالیں تجھ کو ہم
باپ ماں کی آنکھ کے تارے تری دکھیاری ماں
دیر سے چنتا میں گھڑیاں گنتی بیٹھی ہے یہاں
دی ہے بڈھے باپ نے جھڑکی اگر بیٹا تجھے
مت خفا ہو بلکہ میری جان بھلا دل سے اسے
یاد رکھ تجھ کو سکھاتا ہے دھرم تیرا یہی
اس سے نیکی کر ہمیشہ جو کرے تجھ سے بدی
کس لئے چپ چاپ ہے اے میرے پیارے کچھ تو بول
اس قدر کیوں ہوگیا دلگیر گھنڈی دل کی کھول

(۸)

اس کی ان باتوں نے ڈالے زخم دل میں جان میں
اور انڈیلا سیسہ کر کے گرم میرے کان میں
گڑ گیا تھا میں زمیں میں بند تھی میری زباں
وہ ادھر رطب اللساں اور میں ادھر آتش بجاں
لاسکا جب اپنی خاموشی کی خود میں بھی نہ تاب
جی کڑا کر کے دیا آخر اسے میں نے جواب
میں نہیں ہوں اے بھگت بھگوان کے بیٹا ترا
راجہ ہوں کم بخت جسرتھ میں اس اجڑے دیس کا
آج میں کرنے شکار آیا تھا سانبھر کا ادھر
ایک ندی پر ہوا تقدیر سے میرا گزر
پانی بھرتا تھا وہاں فرزند تیرا ہائے ہائے
جالگا بھولے سے اس کو تیر میرا ہائے ہائے
اے رشی اس سے زیادہ اور تجھ سے کیا کہوں
تیری کرپا اور دیا کا اب فقط محتاج ہوں

(۹)

جب رشی میری زبانی سن چکا یہ ماجرا
آگیا غش اس کو اور دھم سے زمیں پر گر پڑا
دیر تک القصہ طاری اس پہ بے ہوشی رہی
نکتہ چیں درد جگر پر خود فراموشی رہی
آہ آخر اک بھری اس نے کہ جل اٹھا جگر
یاد رکھوں گا میں اس آواز غم کو عمر بھر

اس طرح مجھ سے کیا اس تیرہ قسمت نے خطاب
یاس اور حسرت میں تھا ڈوبا ہوا اس کا جواب
خود بخود چل کر نہ میرے پاس تو آتا اگر
اور نہ دیتا اس مصیبت کی مجھے آکر خبر
میرے نورچشم کا یہ خون ناحق بے گماں
روئے دنیا سے مٹا دیتا ترا نام و نشاں
مجھ کو تیرے جرم کی نسبت ہوا پورا یقیں
دیدہ و دانستہ یہ سرزد ہوا تجھ سے نہیں
تو ہے پتلا لغزشوں کا آخر اک انسان ہے
گرچہ تو اس وقت پاپی ہے مگر انجان ہے
ورنہ اے راجہ کسی کارن نہ تو بچتا کبھی
راجدھانی تیری لٹتی نسل بھی مٹتی سبھی
لے چل اب ہم بدنصیبوں کو وہاں تو جلد تر
جس جگہ وہ چاند کا ٹکڑا ہے سوتا بے خبر
تاکہ ہم دل کا نکالیں آخری ارمان بھی
اپنے بچے پر نچھاور جی کریں اور جان بھی

(۱۰)

مار کر دھاڑیں غرض سر پیٹتے روتے ہوئے
اپنے دل کو تھامتے اور جان کو کھوتے ہوئے
میرے پیچھے پیچھے لاٹھی ٹیکتے پہنچے وہاں
سو رہا تھا خاک میں لخت جگر ان کا جہاں

لاش پر دونوں گرے، یوں باپ نے نوحہ کیا
جس کو سن سن کر زمیں کانپی فلک تھرا اٹھا

(۱۱)

بین یہ کر کرکے مجھ پہ ڈھا رہے تھے وہ ستم
آخر اس نے اپنے بیٹے کا کیا کریا کرم
بے خود اور مبہوت بن کر میں کھڑا تھا پاس ہی
یک بیک مجھ پر پلٹ کر یوں لگا کہنے رشی
ایک ہی میرا تھا یہ لخت جگر نور نظر
تو نے اس کی جان لی تجھ پر ہے خوں اس کا ہذر
مجھ پہ بھی اک وار کردو نا ترا احسان ہو
بندش غم سے کہیں آزاد میری جان ہو
یاد رکھ لیکن مرا کہنا بہ ایں جاہ وحشم
تیری قست میں بھی ہے لکھا ہوا بیٹے کا غم

(نگارستان)

صبح

عزیز لکھنوی

جمال مہر انجم سوز محو گرم جوشی ہے
گلوں میں ہر طرف ہنگامۂ انجم فروشی ہے
چمن مطرب تجلی نغمہ زن، عالم نشاط افزا
اگر زاہد بھی پی لے مے تو وقت چشم پوشی ہے
شجر ہیں وجد میں سرشار ہے معمورۂ دنیا
نسیم صبح گاہی مست شغل مے فروشی ہے
افق سے پھیلتی جاتی ہیں کرنیں مست ہے ہر شے
چھلکتا جام ہے ٹوٹی ہوئی مہر خموشی ہے
شفق کا بادۂ گل رنگ ہے اور جام مینائی
طلوع صبح بھی تمہید رسم بادہ نوشی ہے
عزیز آزاد طائر شاخ گل پر چہچہاتے ہیں
حیات اپنی مگر وابستۂ حلقہ بگوشی ہے

(گل کدہ)

جوش ملیح آبادی

خاتون مشرق

غنچۂ دل مرد کا روز ازل جب کھل چکا
جس قدر تقدیر میں لکھا ہوا تھا مل چکا
دفعۃً گونجی صدا پھر عالم انوار میں
عورتیں دنیا کی حاضر ہوں مرے دربار میں
عورتوں کا کارواں پر کارواں آنے لگا
پھر فضا میں پرچم انعام لہرانے لگا
ناز سے حوروں ترانے حمد کے گانے لگیں
عورتیں بھر بھر کے اپنی جھولیاں جانے لگیں
جب رہا کچھ بھی نہ باقی کیسۂ انعام میں
کانپتی حاضر ہوئیں پھر ایشیا کی عورتیں
دل میں خوف شومئی قسمت سے گھبرائی ہوئی
رعب سے نیچی نگاہیں، آنکھ شرمائی ہوئی
علم کے سانچے میں روح ناز کو ڈھالے ہوئے
گردنوں میں خم، سروں پر چادریں ڈالے ہوئے
آخر اس انداز پر رحمت کو پیار آ ہی گیا
میکدے پر جھوم کر ابر بہار آ ہی گیا
مسکرا کر خالق ارض و سماں نے دی ندا
اے غزال مشرقی! آ تخت کے نزدیک آ!

نعمتیں سب بٹ چکیں، لیکن نہ ہو نامضمحل
سب کو بخشے ہیں دماغ، او رلے تجھے دیتے ہیں دل
یہ وہی دل ہے جو مضطر ہو کے سوز وساز سے
میرے پہلو میں دھڑکتا تھا عجب انداز سے
تجھ کو وہ رخ اپنی سیرت کا دئے دیتے ہیں ہم
جس میں یزدانی نسائیت کی زلفوں کے ہیں خم
آ! کہ تجھکو صاحب مہر وفا کرتے ہیں ہم
لے خود اپنی جنبش مژگاں عطا کرتے ہیں ہم
پہلوئے خاتون مشرق میں بصد تمکین و ناز
منتقل ہوجا! لوھیت کے سینے کے گداز
عورتیں اقوام عالم کی بھٹک جائیں گی جب
تو رہے گی بنکے اس طوفان میں اک موج طرب
حسن ہوجائیگا جب اوروں کا وقف خاص وعام
دیدنی ہوگا ترے خلوت کدے کا اہتمام
عالم نسواں پہ کالی رات جب چھا جائے گی
یہ ترے ماتھے کی بیندی صبح کو شرمائے گی
عوتین بیچیں گی جب اسٹیج پر با رقص وچنگ
اپنی آنکھوں کی لگاوٹ اپنے رخساروں کا رنگ
آن کے آگے ہر نیا میدان ہوگا جلوہ گاہ
اور ترا اسٹیج ہوگا صرف شوہر کی نگاہ
گودیاں پھیلا کے جب مانگیں گی باصدق و صفا
عورتیں اولاد کے پیدا نہ ہونے کی دعا

مژدہ باد اے ایشیا کی دختر پاکیزہ تر!
آنچ آئے گی نہ تیرے مادرانہ ذوق پر
ماؤں کی غفلت سے جب بچوں کو پہنچے گا گزند
جب فغاں بے تربیت اولاد کی ہوگی بلند
صرف اک تیرا تبسم اے جمال تابناک
سینۂ اطفال میں پیدا کرے گا روح پاک
وہ تری معصوم رعنائی نہ ہوگی مضمحل
بخشی ہے نسل انسانی کے پہلو کو جو دل
وہ بھی دن آئیگا جب تجھکو اے مست حجاز
زیب دیگا «مادرِ اولادِ آدم» کا خطاب

(فکر و نشاط)

غزلیات

خواجہ درد

گر دیکھئے تو مظہر آثار بقا ہوں
اور سمجھئے جوں عکس مجھے محو فنا ہوں

ممنوں مرے فیض کے سب اہل نظر ہیں
جوں نور ہر اک چشم کا دیدار نما ہوں

ہے مظہر انوار صفا میری کدورت
ہر چند کہ آہن ہوں پر آئینہ بنا ہوں

احوال دو عالم ہے مرے دل سے ہویدا
سمجھا نہیں تا حال یہ اپنے تئیں کیا ہوں

ہوں قافلہ سالار طریق قدما درد
جوں نقش قدم خلق کو میں راہ نما ہوں

ارض و سماں کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال تجھے منھ دکھا سکے

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے
نقش قدم کی طرح نہ کوئی اٹھا سکے
قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے
غافل خدا کی یاد پہ مت ہو زینہار
اپنے تئیں بھلادے اگر تو بھلا سکے
یا رب یہ کیا طلسم ہے اور اک و فہم یاں
دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے
اطفائے نار عشق نہ ہو آب اشک سے
یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے
مست شراب عشق وہ بیخود ہے جس کو حشر
اے درد چاہے لائے بخود پر نہ لا سکے

(دیوان درد)

میر تقی میر

مانند شمع مجلس شب اشکبار پایا
القصہ میر کو ہم بے اختیار پایا
احوال خوش انہوں کا ہم بزم میں جو تیرے
افسوس ہے کہ ہم نے واں کا نہ بار پایا
چیتے جو ضعف ہوکر زخم رسا سے اس کے
سینے کو چاک دیکھا دل کو فگار پایا
شہر دل ایک مدت اجڑا ایسا غموں میں
آخر اجاڑ دینا اس کا قرار پایا
کیا اعتبار یاں کا پھر اس کو خوار دیکھا
جس نے جہاں میں آکر کچھ اعتبار پایا
آہوں کے شعلے جس جا اٹھتے تھے میر سے شب
واں جا کے صبح دیکھا مشت غبار پایا

فصل خزاں میں سیر جو کی ہم نے جائے گل
چھانی چمن کی خاک نہ تھا نقش پائے گل
اللہ رے عندلیب کی آواز دل خراش
جی ہی نکل گیا جو کہا ان نے ھائے گل

یہ دیکھ سینہ داغ سے رشک چمن ہے یہاں
بلبل ستم ہوا نہ جو تو نے بھی کھائے گل

بلبل ہزار جی سے خریدار اس کی ہے
اے گل فروش کریو سمجھ کر بہائے گل

بارے سرشک سرخ کے داغوں سے رات کو
بستر پر اپنے سوتے تھے ہم بھی بچھائے گل

گلچیں سمجھ کے چنیو کہ گلشن میں میر کے
لخت جگر پڑے ہیں نہیں برگہائے گل

(کلیات میر)

مومن

جلتا هوں هجر شاهد و یاد و شراب میں
شوق ثواب نے مجھے ڈالا عذاب میں

کہتے هیں تم کو هوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام هوئے ایک خواب میں

مطلب کی جستجو نے یہ کیا حال کردیا
حسرت بھی اب نہیں دل ناکامیاب میں

ناکامیوں سے کام رها عمر بھر همیں
پیری میں یاس هے جو هوس تھی شباب میں

ناصح هے عیب جوئے و دل آزار اس قدر
گویا ثواب هے سخن ناثواب میں

کیا جلوے یاد آئے که اپنی خبر نہیں
بے بادہ مست هوں مین شب ماهتاب مین

پیہم سجود پائے صنم پر دم و داغ
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

مومن

در بدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے
ناتوانی مری مت پوچھ کہوں کیا ہمدم
بات کہنے میں مرا دم ہی ہوا ہوتا ہے
چاک پیراہن گل پر تو نہ پھول اے بلبل
جامہ یاران لبابسی کا قبا ہوتا ہے
ہو نہ بیتاب غم ہجر بتاں میں مومن
دیکھ دو دن میں بس اب فضل خدا ہوتا ہے

(دیوان مومن)

غالب

سب کہاں؟ کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں!

یاد تمھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہوگئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہوگئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں نجیۂ چاک گریباں ہوگئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اہل جہاں!
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

غالب

حضور شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایان چمن کی آزمائش ہے
قدو گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبر اہل انجمن کی آزمائش ہے
نہیں کچھ سبحہ وزنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
رگ و پے میں جب اترے زہر غم تب دیکھئے کیا ہو!
ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے
وہ آئیں گے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالب
نئے فتنوں میں اب چرخ کہن کی آزمائش ہے

(دیوان غالب)

رباعیات

انیس

غافل ہے وہ جو عاقبت اندیش نہیں
وہ کونسا نوش ہے جو بے نیش نہیں
جاتے ہیں جہاں سے لوگ آگے پیچھے
افسوس کہ کچھ تجھ کو پس و پیش نہیں

آفاق میں مرنے کے لئے جینا ہے
اس زیست پہ کیا حد ہے کیا کینا ہے
جم کا ہے نہ جام اور نہ دارا کا شکوہ
احوال سکندر کا تو آئینا ہے

راتیں نہ وہ اب ہونگی نہ خواب آئیگا
آیا بھی تو زیست کو جواب آئے گا
اٹھو اب انتظار کس کا ہے انیس
نہ عمر پھرے گی نہ شباب آئے گا

کس بات میں کید کس میں تز و بر نہیں
جز حرف غلط زباں پہ تقریر نہیں
اس عہد میں راستی کا کیونکر ہو رواج
مسطر کج ہے قلم کی تقصیر نہیں

(مجموعہ رباعیات انیس)

حالی

تا زیست وہ محو نقش موہوم رہے
جو طالب دوستاں معصوم رہے
اصحاب سے بات بات پر جو بگڑے
محبت کی وہ برکتوں سے محروم رہے

ہیں بے ہنروں میں قابلیت کے نشاں
پوشیدہ ہیں وحشیوں میں اکثر انساں
عاری ہیں لباس تربیت سے ورنہ
ہیں طوسی و رازی انہیں شکلوں میں نہاں

احساں کے ہے گر صلہ کی خواہش تم کو
تو اس سے یہ بہتر ہے کہ احساں نہ کرو
کرتے ہو گر احسان تو کردو اسے عام
اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنوں نہ ہو

صوفی کو کسی نے آزمایا ہی نہیں
نیکی میں شک اسکی کوئی لایا ہی نہیں
ہو سکہ رائج میں بھی شاید کچھ کھوٹ
پر اسکو کسی نے یہاں تپایا ہی نہیں

هیں یار رفیق پر مصیبت میں نہیں
ساتھی ہیں عزیز - لیک ذلت میں نہیں
اس بات کی انسان سے توقع ہے عبث
جو نوع بشر کی خود جبلت میں نہیں

اسباب پہ گر نظم جہاں کا ہے مدار
اس قوم کا چیتنا ہے حالی دشوار
عزت کی نہیں ہے جسکو ہرگز پروا
ذلت سے نہیں ہے جسکو ہرگز کچھ عار

(دیوان حالی)